ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۱۴ — ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء

اِن کا جُرم مزدوروں کے لیے روٹی مانگنا ہے

مضمون صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ فرمایئے

قیمت: مغربی پاکستان — [illegible] پیسے
مشرقی پاکستان — [illegible] پیسے

سیّد عبدالحمید عدمؔ

ایک ہی راستہ

(زندہ باد صفدؔر میر)

جس ظُلم و سِتم کی دنیا میں۔ اِنسان کی قیمت مٹّی ہو
اُس ظلم و سِتم کی دنیا سے ۔ ہجرت کر جانا۔ بہتر ہے
انصاف کے قاتِل زرداروں ۔ کے رحم و کرم پر جینے سے
عزت کی حفاظت کی خاطر۔ بھُوکے مر جانا۔ بہتر ہے

٭

مہنگائی

موسمِ سرما کی جاں فرسا ہواؤ ۔ تم چلو
رحم سے لبریز ہوکر۔ تھم نہ جاؤ ۔ تم چلو
کیونکہ تم ہی ۔ باعثِ ولادہ زیٔ اِنساں نہیں
کیونکہ تم جو کچھ بھی ہو ۔ اتنی ضرر ساماں نہیں
جس قدر اشیاء کی مہنگائی کا زھریلا اثر
جس کی پرچھائی سے۔ پھٹ جاتا ہے مفلس کا جگر



صفدر میر

سچّائیاں

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ

الفتح

کراچی

جلد:- ۱ شمارہ:- ۳۵

۱۴ – ۲۱ جنوری سنہ ۱۹۷۱ء

نگرانِ اعلیٰ

شوکت صدیقی

مدیر

ارشاد راؤ

معاونین خصوصی

صفدر میر ——— منہاج برنا

مجلسِ ادارت

محمود شام - اشرف شاد - وہاب صدیقی

سرورق: ——— الطاف رانا

بحرین، کویت ——— ۶۰ فلس
دوبئی، قطر ——— ۵، درہم
سعودی عرب ——— ۱۵ قرش
انگلستان ——— ۲ شلنگ، ۶ پنس

اداریہ

عوامی طاقتوں کی آزمائش

صفدر میر - مقتدر صحافی - بزرگ شاعر - ممتاز دانشور جیل میں ہیں اور ۶ جنوری سے ہڑتال پر ہیں۔

قلم کا ساتھ ذہن اور کتاب نے بھی دیا ہے۔ صفدر میر کے ساتھ چپراسیوں کی یونین کے صدر، دو طالب علم رہنما، صحافی اور سیاسی کارکن بھی ہیں۔

جیل سے بہت دُور پی پی ایل کی عمارت کے سامنے بھوک ہڑتالیوں کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہو رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کے عوامی جدوجہد کے وعدے پورے ہو رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے یہ رسم وفا پنجاب اسمبلی کے منتخب رکن، کرکٹ کے درخشندہ ستارے عبدالحفیظ کاردار کی قیادت میں کئی ارکانِ اسمبلی اور پیپلز پارٹی کے جیالے کارکنوں نے نبھائی ہے۔ ہر روز چھ افراد اس بھوک ہڑتال میں شامل ہو رہے ہیں۔ جیل کے دروازے کھل رہے ہیں، بھوک کی شدّت برداشت کی جا رہی ہے مگر پی پی ایل کی انتظامیہ، لاہور کی انتظامیہ، پنجاب کی انتظامیہ اور مارشل لاء حکومت سب خاموش ہیں، مارشل لاء کا ضابطہ ۱۶ الف حرکت میں آیا تو صفدر میر اور اُن کے پانچ ساتھیوں کے خلاف۔ کیونکہ اُن کی بھوک ہڑتال سے شاید ملک کا امن و امان خطرے میں پڑنے کا ڈر تھا مگر صفدر میر اور اُن کے ساتھیوں کی گرفتاری سے ظلم کے خلاف احتجاج کا سیلاب رُک نہیں سکا۔ اس معرکے میں وہ رہنما اور کارکن بھی شامل ہو رہے ہیں جنھیں عوام اپنے نمائندوں کے طور پر منتخب کر چکے ہیں۔ اور جنھیں عوام اختیار دے چکے ہیں۔ یہ

بدلِ اشتراک

	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
مغربی پاکستان	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
مشرقی پاکستان	۶۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

خط و کتابت کے لئے

دفتر ہفت روزہ "الفتح"، ۸۰ ڈی - نرسری کمرشل ایریا - پی، ای، سی، ایچ، ایس - کراچی ۲۹

ایڈیٹر پبلشر ارشاد راؤ ٥ مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

مقام اشاعت: ۸۰ ڈی نرسری کمرشل ایریا، پی ای سی ایچ ایس - کراچی ۲۹

سب احتجاج - پی پی ایل کی انتظامیہ کے اس ظلم کے خلاف ہے جو ۲۴ کارکنوں کو برطرف کرکے ۲۴ خاندانوں کی زندگی اجیرن کر چکی ہے اور یہ اُن بے شمار برطرفیوں میں ایک اضافہ ہے جو اپریل ۱۹۷۰ء کی ہڑتال کے بعد کی گئی تھیں، جس میں پی پی ایل کے برسوں پرانے اور مخلص کارکن پی پی ایل سے الگ کر دیے گئے، جن کا خون پی پی ایل کی تعمیر میں شامل ہے۔ اب جب کہ عوام ظلم کی ایسی تمام قوتوں کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس وقت یہ برطرفیاں پُرسکون جھیل میں کنکر ڈال کر یہ دیکھنے کی کوشش ہے کہ اس سے اُبھرنے والی لہریں کتنی دور تک پھیلتی ہیں۔ ظلم نے ایک بار پھر مظلوم کے صبر اور ہمت کا امتحان لیا ہے۔ مزدوروں کو کارخانوں سے نکالا جا رہا ہے، کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ اخباری کارکنوں کو اخبارات سے الگ کیا جا رہا ہے۔ یہ انتخابات کے نتائج کو کالعدم قرار دلوانے کی منظم سازش کڑیاں ہیں۔ اسی لیے صفدر میر جیسے بزرگ صحافی نے بھوک ہڑتال کا انتہائی قدم اُٹھا کر تمام عوام دوست سیاسی طاقتوں، غیر جانبدار مارشل لاء حکومت کو اس واقعے کی سنگینی کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ صفدر میر کی اس دعوتِ احساس پر پیپلز پارٹی کے عبدالحفیظ کاردار، ساجد یسین، مختار رانا، معراج خالد، اور احمد رضا خاں قصوری نے لبیک کہہ کر عوام دوست سیاسی طاقتوں کی نمائندگی کی ہے۔ تمام عوام دوست صحافی، عبدالحفیظ کاردار ان کے سیاسی رفیقوں اور پیپلز پارٹی کے جیالے کارکنوں کو سلام کہتے ہیں۔

صفدر میر کی بھوک ہڑتال صرف صحافی طبقے کے حقوق کی بحالی کے لئے جدوجہد نہیں ہے بلکہ یہ ظلم کی ہر کوشش کے خلاف بھرپور احتجاج ہے۔ یہ جدوجہد زمینوں سے ان کے بیٹوں کو الگ کرنے، کارخانوں سے ان کے دست و بازو مزدوروں کو علیحدہ کرنے، اخباری کارکنوں کو اخبارات سے نکالے جانے کے خلاف ہے۔ یہ جنگ نہ صرف پی پی ایل سے برطرف کئے جانے والے کارکنوں کے لیے ہے بلکہ جنگ، مشرق، پی پی آئی، کوہستان، جسارت سے بے روزگار کیے جانے والے کارکنوں کے حق میں بھی ہے۔ صفدر میر پی پی ایل کے ایک ملازم کا نام نہیں ہے۔ بلکہ صفدر میر ظلم کے خلاف مظلوموں کے احتجاج کی علامت ہے۔ لوگ اس علامت کی عظمت سے آشنا ہیں۔ عوام دوست طاقتیں ظلم کے خلاف اس احتجاج کو اس وقت تک جاری رکھیں گی جب تک ظلم مٹ نہیں جاتا، ظالم تباہ نہیں ہو جاتے۔ پی پی ایل کی طرح جنگ، مشرق، پی پی آئی کے مظلوم اور بے روزگار صحافی بھی ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والے ہیں۔ مظلوم صحافی اور مظلوم عوام جہاں پنجاب پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کو سلام کہتے ہیں، وہاں سرحد پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کو بھی خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ سندھ بلوچستان اور مشرقی پاکستان کی عوام دوست طاقتوں سے بھی اس احتجاج میں شریک ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ مظلوم صحافی اور بے بس عوام کے دل سندھ اور کراچی کے رہنماؤں کی خاموشی پر مضطرب ہیں۔ جے۔اے۔رحیم کیوں چپ ہیں۔ میر رسول بخش تالپور کہاں ہیں، میر علی احمد تالپور کیوں خاموش ہیں۔ معراج محمد خاں میدان میں کیوں نہیں نکلے۔ صحافی، طارق عزیز کی آواز کو ترس رہے ہیں۔ جنگ، مشرق، پی پی آئی کی انتظامیہ کے ظلم کے شکار صحافی عوام کو ظلم کی داستانیں کیوں نہیں سناتے۔ اپنا حق مانگنے کے لیے وہ آگے کیوں نہیں بڑھ رہے؟

اس جدوجہد میں جب تک تمام صحافی، تمام عوام، تمام مزدور، تمام سیاسی کارکن شامل نہیں ہوں گے، ظلم نہیں مٹے گا۔ نہیں مٹے گا۔ نہیں مٹے گا۔

تاشقند اور مسئلۂ کشمیر

کشمیر میں مسلح جدوجہد ختم کرنے کے لئے حکومت نے خفیہ ہدایات جاری کی ہیں

موجودہ حکومت مسئلہ کشمیر کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کر رہی ہے

وقائع نویس

مقبوضہ کشمیر میں ایک بار پھر عوام آزادی کے لئے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔

کشمیریوں کے بہتے ہوئے خون اور زخموں کے درمیان روس نے معاہدۂ تاشقند کی سالگرہ پر بھارت اور پاکستان کو بہتر تعلقات کی مبارکباد دی ہے۔

سری نگر میں طلبہ اور عوام نے بھارتی سامراج کے خلاف پھر آواز اٹھائی ہے۔ اور یہ سب کچھ ۱۰ جنوری کے آس پاس ہوا ہے۔ جس دن تاشقند کا شرمناک معاہدہ طے پایا تھا۔ پاکستان میں پہلے عام انتخابات کے ذریعے عوامی حکومتوں کے قیام کے امکان سے بھارتی توسیع پسندوں کو پریشانی لاحق ہونا ایک یقینی امر ہے۔ ادھر پاکستان کی دونوں اکثریتی جماعتوں کے سربراہوں مسٹر بھٹو نے زیادہ زور سے اور مجیب نے پہلی مرتبہ کشمیریوں کے حقِ خود اختیاری کے لئے جدوجہد کا یقین دلایا ہے۔ اسی دوران دولتِ مشترکہ کے ممالک کی کانفرنس بھی ہو رہی ہے اس میں شرکت کے لئے جاتے ہوئے برطانیہ کے وزیرِ اعظم مسٹر ایڈورڈ ہیتھ پاکستان میں دو روز کے لئے ٹھہرے تو انہوں نے فرمایا، "برطانیہ کشمیر کے تنازعے میں غیر جانبدار رہے گا۔" اس پر تنقید کرتے ہوئے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستانی اور کشمیری عوام کے دلوں کی ترجمانی کی ہے کہ کشمیر کا جھگڑا برطانیہ کا پیدا کردہ ہے اور یہ بڑا منافقانہ بیان ہے کہ برطانیہ اس مسئلے میں غیر جانبدار رہے گا۔ بھٹو صاحب نے ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ریڈکلف ایوارڈ کی یادگار ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ برطانیہ نے دوسری سامراجی قوتوں کی طرح جاتے جاتے اپنی اس نو آبادی میں کشمیر کا زخم لگا دیا تاکہ وہ ناسور کی طرح رستا رہے اور دو ترقی پذیر قومیں آپس میں برسرِپیکار رہیں۔







اوپر سے نیچے امان اللہ خان، مقبول احمد بٹ اور میر عبدالمنان جنہیں کشمیر کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا

مغربی طاقتوں نے کشمیر کے مسئلے سے ہمیشہ جانبداری کا ثبوت دیا ہے۔ امریکہ، فرانس، برطانیہ، اور روس سب نے بھارت یعنی ظالم سے جانبداری اور کشمیری عوام یعنی مظلوموں سے غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا۔ اقوامِ متحدہ نے آج تک سنجیدگی سے اس مسئلے کو حل کرنے کی طرف توجہ نہیں دی اس سے زیادہ مجرمانہ حرکت ہماری اب تک کی حکومتیں کرتی رہی ہیں۔ آخر میں ایوب خاں نے تاشقند میں جو کچھ بھی طے کیا تھا، وہ اگرچہ ایک راز ہے لیکن ایک کھلا راز۔ کہ اب ہم کشمیر کے مسئلے کو اقوامِ متحدہ میں لے جانے کے بھی قابل نہیں رہے۔ کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ کوسیگن صاحب نے یہی مشورہ دیا تھا کہ "جو تمہارے پاس ہے تم رکھو، جو بھارت کے پاس ہے اس کے پاس رہنے دو۔ اگر کسی جگہ مسلمان زیادہ تعداد میں ہیں تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ پاکستان کا حصہ ہے۔ اس طرح کل آپ تاجکستان اور ازبکستان کو بھی پاکستان کا حصہ بنائیں گے۔"

معاہدۂ تاشقند کے بعد حکومتِ پاکستان نے اقوامِ متحدہ میں کشمیر کا مسئلہ نہیں اٹھایا، اقوامِ متحدہ ایک طرف۔ اسلامی ملکوں کی وزرائے خارجہ کی کانفرنسوں میں بھی پاکستان نے اس سے اجتناب کیا۔ اور کشمیر کا مسئلہ اٹھائے بغیر بھارت سے تعلقات بحال کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ہاکی ٹیم بلائی جا رہی ہے بھارتی فلموں کی درآمد کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ انٹیلی جنٹس کے ایک اعلیٰ افسر کے ذریعے پاکستان بیوروکریسی نے آزادیٔ کشمیر کے لئے مسلح جدوجہد کا ارادہ رکھنے والوں کو منع کیا تھا کہ حکومتِ پاکستان ایسی کوششوں کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بہت شرمناک امر ہے۔ تاشقند سپرٹ کو بروئے کار رکھنے کے لئے ہمیں پچاس لاکھ کشمیریوں سے کئے ہوئے عہد کو نہیں بھولنا چاہیئے۔ ان سے ہمارا انسانیت کا رشتہ ہے، مذہب کا رشتہ ہے، مظلومیت کا رشتہ ہے،

امریکہ، برطانیہ، روس اور بھارت کی سازش کا وہ بھی شکار ہیں، ہم بھی اس سازش کا نشانہ ہیں۔

ہم کشمیری عوام کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ معاہدۂ تاشقند کی سالگرہ کے موقع پر انہوں نے بھارتی توسیع پسندوں کے خلاف مظاہرے کر کے، خون بہا کے، روسی سوشل سامراج اور پاکستان کے مصلحت پسندوں کو احساس دلایا ہے کہ تاشقند جیسے معاہدے بھی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والی قوموں کے جذبۂ حریت کو نہیں مٹا سکتے۔

کشمیر اس وقت بین الاقوامی سازشوں کا مکمل طور پر شکار بنا ہوا ہے۔ امریکہ اور روس چین کے خلاف حصار کھینچنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس کے لئے



عبدالخالق انصاری جو اپنی ہی حکومت کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے

کشمیر جغرافیائی طور پر بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے وہ کسی طور پر نہیں چاہتے کہ کشمیر کے حریت پسند عوام اور پاکستان کے باشعور اور سامراج دشمن عوام کے درمیان سے جغرافیائی فاصلے ختم ہو جائیں اور وہ مبادا اتنی بڑی طاقت بن جائیں کہ امریکہ اور روس اپنے سامراجی خوابوں کی تعبیر حاصل نہ کر سکیں۔

کشمیر کو آزادی امریکہ، روس یا برطانیہ سے بھیک مانگ کر نہیں ملے گی، اس آزادی کے حصول کا راستہ وہی ہے جو الجزائر کے عوام نے اختیار کیا تھا۔ اور جو اس وقت ویت نام، فلسطین، انگولا اور موزمبیق کے عوام نے اختیار کر رکھا ہے۔ کشمیر کے عوام متحد ہو کر جب یہ راستہ اختیار کریں گے تو پاکستان کے مصلحت اندیش بھی مجبور ہو جائیں گے کہ وہ جدوجہد کرنے والوں کا ساتھ دیں اور بھارت کے توسیع پسند بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

آزادئ صحافت کا قافلہ

آزادئ صحافت کے میرِ کارواں، پی پی ایل ورکرز یونین کے صدر، پاکستان ٹائمز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر، ممتاز صحافی، دانشور اور مارشل لا و ضابطہ نمبر ۱۶ اے کے ملزم مسٹر صفدر میر نے نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑنے اور آزادئ صحافت کی بحالی کے لئے جس جدوجہد کا آغاز کیا ہے، ۱۱ جنوری ۱۹۷۰ء تک اس قافلے کے لاکھوں مظلوم عوام میں سے بھوک ہڑتال کرنے والوں کی تعداد ۲۸ تک پہنچ چکی ہے۔

ان میں سے گرفتار ہونیوالوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ جناب صفدر میر، ۲۔ چوہدری برکت، ۳۔ حامد جیلانی، ۴۔ شاہد مشتاق ناگی، ۵۔ محمد خاں، ۶۔ انوار الحق غازی، ۷۔ راحت ملک (گجرات)، ۸۔ لطیف بھٹی (گجرات)، ۹۔ حامد جیلانی (لاہور)، ۱۰۔ سلیم جنجوعہ (لالہ موسیٰ)، ۱۱۔ جاوید افغانی (لالہ موسیٰ)

یہ اصحاب جیل میں بھوک ہڑتال پر ہیں۔ مشتاق ناگی صاحب کو شدید علالت کی بناء پر جیل سے میو ہسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ باقی مجاہدوں کا وزن بھی تیزی سے کم ہو رہا ہے۔

آزادئ صحافت کے مورچے پر جن جیالوں نے بھوک ہڑتال میں شرکت کی ہے۔ ان میں پاکستان پیپلز پارٹی، نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن پی پی ایل کے صحافی اور سب کا کپتان عبدالحفیظ کاردار بھی شامل ہیں۔ فہرست درجِ ذیل ہے۔

۱۔ قومی اسمبلی کے رکن کپتان عبدالحفیظ کاردار

۲۔ جمیل باجوا (این۔ ایس۔ ایف)

۳۔ شیخ عبدالحفیظ، چیئرمین پیپلز پارٹی لوہاری گیٹ۔

۴۔ ناصر خاں، چیئرمین پیپلز پارٹی، رام گڑھ

۵۔ عابد جمیل باجوہ پیپلز پارٹی۔

۶۔ اجمل نیازی طالب علم رہنما

۷۔ ابوالبرکات سینئر سب ایڈیٹر پاکستان ٹائمز

۸۔ میاں حامد یاسین (پیپلز پارٹی رکن قومی اسمبلی)

۹۔ مسٹر محمد یوسف چوہدری جنرل سیکرٹری پیپلز پارٹی شیخوپورہ۔

۱۰۔ مسٹر محمد اشرف سابق ڈائریکٹر پی پی ایل (پیپلز پارٹی)

۱۱۔ جبر امسکین پیپلز پارٹی لائل پور

۱۲۔ علی اصغر سینئر رپورٹر پاکستان ٹائمز

۱۳۔ محمد خالد پیپلز پارٹی لاہور

۱۴۔ عبدالواحد پیپلز پارٹی لاہور

۱۵۔ محمد طفیل پیپلز پارٹی لاہور

۱۶۔ چوہدری نذیر احمد صدر پاکستان پریس ورکرز فیڈریشن۔

۱۷۔ افتخار علی بٹ پیپلز پارٹی

۱۸۔ سیّد نثار احمد جعفری پیپلز پارٹی

۱۹۔ اسلم شیخ پیپلز پارٹی۔

۲۰۔ خواجہ مقصود الحسن پیپلز پارٹی

۲۱۔ طارق محمود پیپلز پارٹی

۲۲۔ محمد جمیل پیپلز پارٹی

۲۳۔ فاتح سہگل، مختار رانا، ایم این اے

۲۴۔ صاحبزادہ احمد رضا قصوری، ایم این اے

ہنگاموں کی سازش میں پولیس اور نوکر شاہی شریک تھی

: محمود شام :

مغربی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں آگ بھڑک اٹھی۔

بظاہر یہ تمام ہنگامے اور اشتعال ایک ایسی کتاب کے بارے میں تھا۔ جو ایک غیر ملکی مصنف کی شرمناک گستاخیوں اور دریدہ دہنیوں کا مظاہرہ تھی۔ اس گستاخی کا مرتکب برطانیہ کا ایک بھارتی نژاد یہودی ہے۔ ایسی کتابوں پر پہلے بھی پاکستان کے غیور اور ناموسِ رسول کے شیدائی مسلمانوں نے پُرزور احتجاج کیا ہے، غازی علم دین شہید بھی پاکستان کی سرزمین کے ہی ایک فرزند تھے، جنہوں نے ایسی ہی گستاخی کے مرتکب کو موت کے گھاٹ اتار کر خود جام شہادت نوش کر لیا تھا۔ لیکن اب کہ ایک دو روز جو ہنگامے ہوئے، اور توڑ پھوڑ کی جو وارداتیں ہوئیں، ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ جلوس کتاب کے نام پر نکالے گئے۔ ان جلوسوں میں ایسا کوئی بینر تھا نہ نعرے تھے، جس سے اس کتاب کے خلاف احتجاج کا اظہار ہوتا۔ نہ ان جلوسوں کی قیادت کرنے والوں کا پتہ چلتا تھا۔ برٹش کونسلوں پر حملے کئے گئے اور اس کے بعد شراب خانے اس توڑ پھوڑ کا نشانہ بن گئے، کراچی تو شراب خانوں کا شہر ہے، میکلوڈ روڈ، الفنسٹن، صدر، بندر روڈ، ایمپریس مارکیٹ، گارڈن روڈ پر ڈھونڈ ڈھونڈ کر شراب خانوں کو تباہ کیا گیا۔ اس کتاب پر احتجاج اور شراب خانوں کی تباہی کے درمیان کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔ اور نہ یہ کوئی با مقصد مہم تھی، نہ اس سے شراب کی دکانیں ختم ہو جائیں گی، کیونکہ ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا کہ پاکستان میں شراب پر مکمل پابندی عاید کی جائے۔ اور نہ کوئی یہ ایسی مہم تھی۔ جس میں تمام شراب خانوں کو تباہ کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہو۔ انٹر کانٹی نینٹل، پیلیس، لڈو، تاج، میٹروپول، مڈوے اور دوسرے بڑے بڑے عیاشی کے اڈے اور شراب خانے اب بھی جگمگا رہے ہیں۔ پولیس اور فوج کے آنے کے بعد یہ ڈرامہ ایکا ایکی ختم ہو گیا۔

مذکورہ کتاب کے بارے میں تقریریں کرنے، جلوس نکالنے، توڑ پھوڑ کرنے والوں میں سے کسی کو اس کتاب کے بارے میں مکمل معلومات نہ تھیں۔ پہلے اس کتاب کو برطانیہ سے منسوب کیا جاتا رہا، پھر پتہ چلا کہ یہ کتاب امریکہ میں شائع ہوئی ہے، اس رسوائے زمانہ کتاب کو سب سے پہلے دیکھنے والوں نے یہ زحمت تو نہ کی کہ اس کے بارے میں مکمل رپورٹ تیار کر کے احتجاج دائر کرتے، انہوں نے اس کتاب کی آڑ میں پورے ملک کو ہنگاموں کی آگ میں لپیٹ دینے کا خوفناک منصوبہ بنا لیا۔ لاہور کے مؤقر روزنامہ "مساوات" کے مطابق اس کتاب پر چار ماہ

ظاہری خبریں

اندرونی کہانیاں

پہلے بھی احتجاج ہوا تھا۔ اس پرانی خبر کو بنیاد بنا کر اب یہ ہنگاموں کی لہر شروع کر دی گئی۔ بات یہ ہے کہ چار ماہ پہلے ان ہنگاموں کی ذمہ دار جماعتِ اسلامی انتخابی مہم میں مصروف تھی۔ ان دنوں اسے انتخاب جیتنے کا یقین تھا اس لئے "ناموسِ رسولؐ" کی پرواہ نہ تھی۔ صرف ناموسِ اقتدار کا خیال تھا۔ ورنہ اگر یہ جماعت رسول اللہؐ کی اتنی ہی شیدائی ہوتی تو اسی وقت اپنی انتخابی مہم چھوڑ کر اس گستاخی کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتی۔ وقت، وقت کی بات ہے۔ اب اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے دوسری شکست خوردہ سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر لوٹ مار اور ہنگاموں کا پروگرام بنا کر اس نے سیاسی سطح پر ابھرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے انتخابات کے فوراً بعد کہا تھا کہ پاکستان میں عوام کی اصل دشمن اب بھی یہی جماعت ہے، انتخابات میں اس کی ناکامی سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ختم ہو گئی ہے۔ اس کی تنظیم اب بھی باقی سب جماعتوں سے زیادہ گہری ہے، اور وہ اب بھی دوبارہ سیاسی زندگی حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گی۔ ملک میں اور خاص طور پر مغربی پاکستان میں بائیں بازو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور طاقت اس امریکہ نواز جماعت کے لئے انتہائی پریشانی کا باعث ہے۔ لاہور میں پی پی ایل کے برطرف شدہ کارکنوں کے لئے صحافیوں اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کی بھوک ہڑتال، ۸ جنوری کو یوم شہداء، ۱۰ جنوری کو یوم ناشقند سے پیدا ہونے والی صورتِ حال سے خوفزدہ ہو کر شکست خوردہ سیاسی جماعتوں نے "ناموسِ رسولؐ" جیسے مقدس جذبے کا سہارا لیا اور پاکستان کے جاں نثارانِ رسولؐ کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کے لئے چار ماہ پرانی خبر کو ہوا دی۔ اس خبر کو ان اخبارات نے زیادہ اچھالا۔ عوام جن کے پیش کردہ، حمایت کردہ اور تشہیر کردہ سیاسی اور دینی رہنماؤں کی ضمانتیں ضبط کروا چکے ہیں لیکن ناموسِ رسولؐ کی حفاظت کے لئے بھی جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور کارکنوں کو بھی بے باکانہ میدان میں اترنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے لئے سراپا احتجاج بنے تو طلبہ، جو بائیں

جماعتِ اسلامی نے اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے لوٹ مار شروع کر دی

بازو سے تعلق رکھتے ہیں۔ شکست خوردہ سیاسی جماعتوں کا یہ آخری حربہ بھی ناکام رہا۔ پروگرام تو یہ تھا کہ طلبہ دیوانہ وار سڑکوں پر نکل آئیں، اور توڑ پھوڑ کی عام وارداتیں شروع ہو جائیں۔ ہنگامے اس قدر بڑھیں اور فسادات اس قدر زیادہ ہوں کہ صورتِ حال قابو سے باہر ہو جائے اور پھر جمہوریت کی بحالی کے خواب بکھر کر رہ جائیں۔ شر پسند عناصر نے اگرچہ موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ پولیس نے بھی شر پسندوں کو کھیل کھیلنے کا پورا موقع دیا۔ پولیس کی طرف سے تخریب پسندوں کو اتنی آزادی اور مہلت دی گئی کہ پولیس کے سامنے لوگوں کی املاک لٹتی رہیں اور انہوں نے کوئی کارروائی نہ کی۔ مثال کے لئے صرف ایک واقعہ کافی ہے کراچی میں جمعہ کے روز فریڈرک کیفے ٹیریا، جہاں شراب خانہ نہیں ہے۔ پونے بارہ بجے کے قریب ہنگامہ کرنے والے صرف تین شر پسندوں کی زد میں آیا۔ انہوں نے شیشے توڑنے شروع کئے۔ پھر لوہے کا جنگلہ توڑا۔ پولیس کے ٹرک قریب آنے لگے لڑکے بھاگ گئے۔ ٹرک رکے بغیر ہی گذر گئے، اور روماشبانہ جاکر رک گئے لڑکے پھر واپس آگئے۔ دروازے توڑ کر کاؤنٹر سے کاغذات، کراکری چٹنی سب اٹھا کر باہر پھینکا گیا۔ اس کے بعد کرسیاں باہر نکال کر توڑی جانے لگیں۔ یہ کارروائی ایک گھنٹے تک جاری رہی، پولیس کو ان تمام واقعات کا علم تھا اور اگر دو سپاہی بھی موقع پر آکر کھڑے رہتے تو کیفے ٹیریا تباہی سے بچ سکتا تھا۔ جب کرسیوں کو آگ لگا دی گئی تو فائر بریگیڈ اور پولیس آئی۔ اس ایک مثال سے یہ احساس ہوتا ہے کہ پورے مغربی پاکستان میں پولیس نے جان بوجھ کر یہ تماشا دیکھا اور تباہی و بربادی کا موقع دیا۔ معلوم نہیں کہ یہ انہوں نے اپنی روایتی عادت کے مطابق کیا یا انہیں کوئی ایسی ہدایات تھیں۔ لوگ اس خدشے میں ہیں کہ بیوروکریسی بھی اس سازش میں شریک ہے۔ ایمپریس مارکیٹ وغیرہ میں کوئی جلوس نہیں پہنچے، یونہی منتشر لوگ پہنچے اور انہوں نے شراب خانے لوٹنے شروع کر دیئے، انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ آج احتجاج کیوں ہو رہا ہے، نہ ان لوگوں کا کوئی لیڈر تھا اور نہ ان کے پیشِ نظر کوئی مقصد تھا، ایک مذاق تھا۔ ایک ہنگامہ تھا۔ فلم کے مناظر چل رہے تھے۔ فلموں کے ہیروؤں کی طرح لوگ کارنامے دکھا رہے تھے۔

ان ہنگاموں سے تمام کاروبار معطل ہو گئے، غریبوں کی زندگی حیران ہو گئی، بچے والدین سے بچھڑ گئے۔ جس کتاب کے سلسلے میں ہنگامے شروع ہوئے اس سے ایک روز پہلے پاکستان کی حکومت اس پر پابندی عائد کر چکی تھی، یہی مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد جماعتِ اسلامی کے ترجمان "جسارت" نے لکھا یہ فیصلہ ہمیں قبول نہیں، ایسے ہی دوسرے اخبارات نے بھی حکومتِ پاکستان کے فیصلے کو تسلیم نہیں کیا۔ جس سے لوگوں کو مزید ہنگاموں پر اکسایا گیا۔ اس روز کراچی میں جو کچھ ہوا، املاک کی تباہی، بے گناہوں کی گرفتاریوں کے بعد۔ جماعتِ اسلامی اور ان کے ہم نواؤں کے الفاظ سے بین السطور نہیں بلکہ کھلم کھلا اس سازش کا انکشاف ہوتا ہے، جو ان ہنگاموں کے پس منظر میں تھی، پہلے روزنامہ "جنگ" کے اداریے کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ عنوان ہے

"کیا صرف احتجاج۔ ؟"

"بہر حال ہم اپنی حکومت پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں پاکستان کے مسلمان بہت زیادہ حساس ہیں اور ان کے جذبات بے حد شدید ہیں حکومت کو صرف احتجاج پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر کوئی قدم اٹھانا چاہیئے۔"

مغربی پاکستان میں بائیں

بازو کی مقبولیت

امریکہ نوازوں

کے لیے پریشانی

کا باعث ہے

حکومتِ پاکستان کے اس اقدام کو معمولی گردان کر بالواسطہ طور پر عوام کے جذبات کو مزید بھڑکانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ ہنگامے جاری رہ سکیں اور جب تک حکومتِ پاکستان یہ انتہائی قدم نہیں اٹھاتی اس وقت تک لوگ ہنگامہ کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صفحۂ اول پر ایک اور کتاب کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ تاکہ وہ کتاب بھی ہنگاموں کا سبب بن سکے۔

روزنامہ "جسارت" کا اداریہ بھی ذرا ملاحظہ ہو۔ عنوان ہے

"ہنگامے کے فکر انگیز پہلو"

دوسرا پیرا ہے۔ "ان ہنگاموں کے کچھ پہلو خاصے فکر انگیز ہیں مثلاً ہنگاموں کے متعلق "اسلام ہمارا مذہب ہے" کا کھوکھلا نعرہ لگانے والی پارٹی کا سربراہ خاموش ہے یومیہ دو بیانات جاری کرنے والے بھٹو صاحب کو اس موضوع پر اظہارِ خیال کے لئے الفاظ فراہم نہیں ہو رہے ہیں اور ان کی یہ خاموشی بڑی پُراسرار نوعیت کی ہے"! پُراسرار نوعیت سے مراد یہ ہے کہ نعوذ باللہ اس کتاب کی اشاعت میں پیپلز پارٹی کا ہاتھ بھی ہے۔ ورنہ شیخ مجیب الرحمٰن نے بھی اس کتاب پر بھی کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا۔ ان کے بارے میں روزنامہ "جسارت" نے کچھ کیوں نہیں کہا اور یہ کیوں نہیں لکھا کہ مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کو ناموسِ رسولؐ کا خیال نہیں رہا۔ وہاں اس قسم کے ہنگامے کیوں نہیں ہوئے، کیا وہاں لوگوں کی غیرت مر گئی ہے۔

آگے لکھتے ہیں۔ "ان مظاہروں کا ایک پہلو یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ان مظاہروں میں مظاہرین کے غیض و غضب کا نشانہ سامراجی ثقافت کے سرچشمے یعنی شراب خانے، نائٹ کلب اور انگریزی فلموں کی نمائش کرنے والے سینما گھر بن رہے ہیں" یعنی ثقافتی انقلاب آگیا ہے۔ لوٹ مار توڑ پھوڑ کی کیا تاویل کی جا رہی ہے۔ اگر ایسی یہ نیک مہم تھی، تو مولانا مولانا مودودی اور ان کے دوسرے ڈپٹی پوپوں کو ان مظاہروں کی قیادت کرنی چاہیئے تھی اور پورے ملک میں شراب خانہ، یا نائٹ کلب بھی نہیں رہنے دینا چاہیئے تھا۔ اور ساتھ

مودودی اور ان کے سامراجی دوست مسلمانوں کے جذبات مشتعل کرنے کا ڈرامہ کھیل رہے ہیں

ساتھ سمگلنگ کے اڈے بھی ختم کر دینے چاہئیں تھے۔

جماعتِ اسلامی نے انتخابات کے نتائج کو کالعدم کروانے کے لئے، اپنی شکست کا زخم چھپانے اور اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے ان ہنگاموں کا جو منصوبہ بنایا تھا۔ اس کی نشاندہی اس اداریے کے ان الفاظ سے ہوتی ہے "مظاہرین کی خبریں اور تصویریں بتا رہی ہیں کہ مظاہرین میں غالب اکثریت نوجوانوں اور طالب علموں کی ہے یہ وہ نسل ہے جسے عام طور پر مذہب کی گرفت سے آزاد بتایا جاتا ہے، جب مذہب کی گرفت سے نسبتاً آزاد ہونے والی نسل کی رسولِ اکرم سے محبت و عقیدت کا یہ عالم ہے کہ وہ شانِ رسالت میں سمندر پار ملک کے ایک فرد کی گستاخی پر آگ بگولہ ہو گئی تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اندرونِ ملک سیکولر اور مذہب دشمن نظریات کو اسلام پر غالب کرنے کا منصوبہ رکھنے والوں کے ساتھ یہ نسل کیا سلوک کرے گی۔ اس ملک میں اسلام کو کمزور سمجھ کر کمیونزم اور سوشلزم کی آمد کی خبر دینے والے نقیبوں کے لئے یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ان کے لئے اس ملک کی سرزمین کتنی سنگلاخ ہے۔"

یہ چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ یہ ہنگامے اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے کروائے گئے ہیں۔ ناموسِ رسول کو صرف بہانہ بنایا گیا۔ مغربی پاکستان میں چونکہ سرمایہ دار، زمیندار، بیوروکریسی اور یہ رجعت پرست طاقتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہیں اور عوام کے اس فیصلے کو ناکام بنانے پر تلی ہوئی ہیں، اس لئے یہ ہنگامے صرف مغربی پاکستان میں ہوئے ورنہ مشرقی پاکستان میں بھی مسلمان بستے ہیں اور اس حصے سے زیادہ تعداد میں ہیں، وہاں ایسا کیوں نہ ہو سکا۔ یہ بہت بڑا سوال ہے؟

جماعتِ اسلامی نے ہمیشہ اسلام اور ناموسِ رسول کے نام پر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے، اشتعال دلایا ہے۔ چند ماہ پہلے ۲۲ خاندانوں میں سے ایک باوانی خاندان کے رسالے "مسلم نیوز انٹرنیشنل" میں قاہرہ سے ایک خط چھپا جس میں رسولِ اکرم کی زندگی کے بارے میں ایک فلم کی تیاری کا ذکر تھا۔ اس کی کہانی ایک مصری مصنف نے لکھی تھی۔ یہ خط پہلے چھپوایا گیا۔ پھر یہ پرچہ اس کے ایڈیٹر خود اخبارات کے دفتر میں لے گئے۔ اس کے پیچھے پیچھے مولانا مودودی کا سائیکلو سٹائل بیان بھی پہنچ گیا۔ ان دنوں بھی ایسے ہی ہنگاموں کا پروگرام تھا۔ مگر کامیاب نہ رہا۔

یہ مولانا مودودی اور ان کے تمام سامراجی دوستوں کی خواہ وہ مصر میں ہوں انڈونیشیا میں۔ یہ پرانی تکنیک ہے، اس طرح وہ لوگوں کے جذبات مشتعل کر کے ڈرامہ کھیلتے ہیں، امن و امان کو خطرے میں ڈالتے ہیں روزنامہ "جسارت" کے ناموسِ رسول سے عشق کا تو یہ عالم ہے کہ کتاب سے متعلقہ ہنگاموں کی خبروں سے زیادہ اہمیت مجیب صاحب پر قاتلانہ حملہ کے ڈرامے کو دی جسے شہ سرخی کے طور پر چھاپا۔ کیا اب کیا مجیب صاحب کی زندگی ناموسِ رسولؐ سے زیادہ اہم ہو گئی تھی؟ یہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہنگاموں کا پروگرام دب گیا تھا۔ اب مجیب صاحب کے قاتلانہ حملے والے ڈرامے کے ہنگامے شروع کروائے جا سکتے تھے، اس لئے فوراً اس کو اہمیت دے دی۔ مقصد یہ ہے کہ انتخابات میں عوام نے جو "غلط" فیصلہ دیا ہے، اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکے۔ کراچی کے امیر جماعت اسلامی کے بیان کے الفاظ بھی اس سازش کا انکشاف کرتے ہیں "یہ پچھلے چند روز سے برطانیہ میں شائع ہونے والی کتاب "ٹرکش آرٹ آف لوان لکچرز" کے خلاف پورے مغربی پاکستان میں طلبہ اور نوجوانوں نے بھرپور مظاہروں کے ذریعے جس غم و غصے کا اظہار کیا ہے وہ ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے جو سرزمینِ پاک پر اسلامی نظام کے علاوہ دوسرے نظاموں میں پاکستانی قوم کی ترقی اور سربلندی کار از پاتے ہیں" یعنی کوئی بات نہیں اگر ہم انتخابات میں ہار گئے، لیکن ایسے مظاہروں کے ذریعے ہم ثابت کر رہے ہیں کہ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں۔

ان ہنگاموں، مظاہروں کا ہماری مارشل لاء حکومت کو سختی سے نوٹس لینا چاہئے کہ وہ عناصر جو انتخابات میں شکست کھا گئے ہیں اب اس طرح ہنگاموں اور مظاہروں کے ذریعے صورتِ حال خطرے میں ڈال کر جمہوریت کی بحالی، اور عوام کو اقتدار کی منتقلی میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ شکست خوردہ جماعتیں کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہی ہیں۔ پولیس کے افسر، انٹیلی جنس کے افسر اپنی بدعنوانیوں کے محاسبے کے ڈر ان جماعتوں کا ساتھ دیتے ہوئے یہ ہنگامے کروا رہے ہیں۔ اگر اس صورتِ حال پر قابو نہ پایا گیا۔ اور اس تخریب کی ذمہ دار جماعتوں کو کچلا نہ گیا تو عوام کو اقتدار کی منتقلی کا مقدس فرض پورا نہ ہو سکے گا۔ یہی طاقتیں اس وقت عوام میں مارشل لاء حکومت کے بارے میں یہ افواہیں بھی پھیلا رہی ہیں کہ یہ سب کچھ حکومت خود کروا رہی ہے تاکہ مارشل لاء کے رہنے کا جواز موجود رہے۔ یہ احساس قوم کے لئے بڑا مایوس کن بھی ہو گا ممکن ہے کہ قوم کو پھر اپنے انتخابی فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انقلابی فیصلے کرنا پڑیں۔

سرورق کی کہانی

سرورق کی تصویر میں داؤد ملز میں مزدوروں کی تاریخی ہڑتال کی قیادت کرنے والے مزدور رہنما عزیز الحسن اور ریاض ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے کھڑے ہیں

روٹی مانگنا سب سے بڑا جرم بن گیا ہے

مزدوروں کے لئے زنداں کے یہ دروازے کب کھلیں گے؟

ان کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں لیکن آنکھوں میں عزم وہمت کی چمک ہے

:- نمائندہ الفتح :-

پچھلے پندرھواڑے کے دوران کراچی کے شہریوں نے مارشل لاء کورٹ کے روبرو حاضری دینے والے دو قیدیوں عزیز الحسن اور ریاض کو دیکھا۔ ہتھکڑیوں کے علاوہ ان پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ عام آدمی نے جانا ——

یہ دونوں اغواء کی واردات میں ملوث ہیں کسی ماں کی مامتا اُجاڑنے کے جرم کے ارتکاب میں پکڑے گئے ہیں تب ہی انہیں بیڑیاں پہنا کر لایا گیا ہے۔

کوئی یہ خیال کر بیٹھا کہ قاتل ہیں۔ شاید کسی گھر کے رہنے والوں کو زندہ جلا دینے کے جرم میں گرفتار ہوئے ہیں۔ انسانی جانوں سے کھیلنے والوں کے پاؤں میں تو بیڑیاں پڑتی ہیں ۔

کوئی سوچ رہا تھا کہ خطرناک ڈاکو ہیں۔ انسانی کی خون کی ہولی کھیل کر، مکانوں کو لوٹ کر، ہنستے کھیلتے شہریوں کو وحشیانہ انداز میں کاٹ کر ان کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بچ نہیں سکے۔ تب ہی تو بیڑیاں ڈالی گئی ہیں

بہتوں نے اچانک مہنگائی، مزدوروں کی چھانٹی، جبری برطرفیوں اور معاشی قتل عام کے پس منظر کو تلاش کیا لیکن انہیں ان میں اس قسم کی موٹی تازی اور گرد فروالی شخصیت نظر نہیں آئی۔ یہ تو اسمگلر اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے بھی نہیں لگتے تھے۔ انہیں تلاش کرنے والے اپنا وقت ضائع کر رہے تھے کیونکہ جب عزیز الحسن اور ریاض مارشل لاء کورٹ کے روبرو پیش ہو رہے تھے مہنگائی، مزدوروں کی چھانٹی، جبری برطرفیوں اور معاشی قتل عام کے ذمہ دار اس سازش میں مصروف تھے کہ ان کے اس تصادم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوانے لئے کس سے رابطہ قائم کیا جائے۔

عزیز الحسن، ریاض اور ان کے ساتھی اس سازش کا بہت پہلے شکار ہو چکے ہیں۔ ان کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے داؤد کاٹن ملز کے مظلوم مزدوروں کے لئے روٹی، کپڑے اور مکان کی منصفانہ جدوجہد کی قیادت کی تھی۔ اس کو کچلنے کے لئے نوکر شاہی نے کیا ظلم روا نہیں رکھا۔ سیٹھوں کے روبرو مزدوروں کے رہنماؤں کو ننگا کر کے زدو کوب کیا گیا، مزدوروں پر گولی چلائی گئی اور بالآخر ملز فوج کے حوالے کر دی گئی۔ اس میں کتنوں کا خون بہا۔ کتنے گرفتار ہوئے اور بیروزگار ہونے والوں پر کیا بیتی۔ الفتح اپنی کسی اشاعت میں اس کی تمام تفصیلات شائع کر چکا ہے

عزیز الحسن کا جرم یہ ہے کہ وہ داؤد کاٹن ملز لیبر یونین (رجسٹرڈ اور اجتماعی سودا کاری کی ایجنٹ) کے جنرل سیکرٹری تھے اور ریاض صاحب نہ صرف ایک فعال اور سرگرم کارکن تھے بلکہ انہیں یونین میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ عزیز الحسن کی عمر بمشکل سترہ اٹھارہ سال کی ہو گی کہ اس نوجوان نے داؤد جیسے ادارے میں نعرۂ حق بلند کیا اور پاکٹ یونین کے لئے دیکھتے ہی دیکھتے ایک زبردست خطرہ بن گئے ریفرنڈم ہوا۔ عزیز کی یونین جیت گئی ۔

یہ جرم اس سماج میں بہت بڑا جرم ہے اور انہیں اسی جرم کی پاداش میں بیڑیاں پہنا کر لایا جاتا ہے۔ جرم ہے، روٹی، کپڑا اور مکان مانگنا۔







عوامی قوتوں کے خلاف ہونے والی سازشوں کا تجزیہ

——— : ارشاد راؤ ———

عوام دشمن خبر رساں ایجنسی پی پی آئی نے پچھلے دنوں یہ خبر پاکستان کے تمام اخبارات کو جاری کی "مغربی پاکستان کے ستر ارکان قومی اسمبلی عوامی لیگ میں شمولیت اختیار کرلیں گے۔ پیپلز پارٹی کے بعض ارکان بھی عوامی لیگ میں شامل ہوجائیں گے۔" عوام دشمن اخبارات نے مذکورہ من گھڑت خبر کو سب سے بڑی خبر کے طور پر شائع کیا۔ اگلے روز مسٹر بھٹو کی پریس کانفرنس تھی۔ اس میں ایک صحافی نے سوال کیا، جس کے جواب میں مسٹر بھٹو نے کہا "آزاد ارکان جس سیاسی جماعت میں شامل ہونا پسند کریں گے ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ تاہم یہ غلط اور بے بنیاد بات ہے کہ پیپلز پارٹی کے بعض ارکان عوامی لیگ کا رخ کر رہے ہیں۔"

مغربی جمہوریت کے تحت چلنے والے پارلیمانی نظام میں سیاسی گٹھ جوڑ، دھڑے بازیاں ارکان اسمبلی کو وزارتوں، لائسنسوں، روٹ پرمٹوں اور دوسرے مالی لالچ دیئے جاتے رہے ہیں۔ ایوب آمریت سے پہلے پاکستان اس تجربے سے گزر چکا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ بھارتی حکمرانوں نے یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ پاکستان میں وزارتوں میں رد و بدل اس قدر ہے کہ ہم اتنی دھوتیاں بھی نہیں بدل سکتے۔ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت میں عوامی تقاضوں سے غفلت نے کمزوری پیدا کردی تھی۔ اس نے ڈاکٹر خان کی ری پبلکن پارٹی کو جنم دیا۔ ان دنوں امور مملکت کم اور جوڑ توڑ، سازشیں اور دوسری پارٹیوں کے ڈھانچوں کو ختم کرنے کے منصوبوں پر زور دیا گیا۔ اس عمل نے عوام کے دلوں میں جمہوریت کے خلاف سخت بددلی پیدا کی اور جب اسکندر مرزا نے ملک میں مارشل لا کے نفاذ کا اعلان کیا تو لوگوں نے فوجی ٹرکوں کو دیکھ کر اپنی بھرپور خوشی کا اظہار کیا۔

ایوب آمریت نے آئین کی بحالی کے بعد جو پارلیمانی ادارے قائم کئے ان میں اکثریت ان کی تھی جنہیں دھاندلیوں بدعنوانیوں، پولیس اور انتظامیہ کے ذریعے منتخب کرایا گیا تھا۔ کنونشن لیگ کو صوبوں اور مرکز میں اکثریتی جماعت کا رتبہ بلا ان اسمبلیوں میں یہ تو ہوا کہ مخالف جماعتوں کے ارکان نے کنونشن لیگ کے ارکان کی سی سرکاری و غیر سرکاری مراعات حاصل کرنے کے لئے اپنی پارٹی کو چھوڑ دیا۔ لیکن کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں، تھانیداروں اور غنڈوں کے زور، زر اور دھاندلی سے اسمبلی تک پہنچنے والوں نے کنونشن لیگ کو خیرباد نہیں کہا۔

ایوب آمریت کی پارلیمنٹوں میں جانے والوں کو عوام کا اعتماد حاصل نہیں تھا۔ لہٰذا انہیں عوام سے زیادہ ان لوگوں کی فکر تھی جنہوں نے انہیں یہ منصب دلایا تھا۔ ان حالات میں نوکر شاہی کی حکمرانی فطری تھی۔ اخبارات میں راجہ، مہاراجہ اور والیان ریاست کی طرح اعلیٰ افسروں کے فرمودات شائع ہوتے تھے جیسا کہ وہی سب کچھ ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام نے جس مارشل لا کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا تھا، وہ بددل ہوگئے اور عظیم عوامی ابھار نے ایوب خان کو ٹھکانے لگا دیا۔

ایوب آمریت کے خاتمے کے بعد ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ملک بھر میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر جو انتخابات ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عوام نے ایسے تمام لیڈروں کو مسترد کردیا جن کی جماعتیں ملک کے دونوں حصوں میں برابر کی مقبولیت کی دعوے دار تھیں۔ سب سے زیادہ شور جماعت اسلامی کا تھا اور اس کا ہی حشر سب سے برا ہوا۔ بنگلہ دیش میں عوامی لیگ اور دوسرے حصے میں پنجاب اور سندھ میں، پیپلز پارٹی نے جھنڈے گاڑ دیئے۔ کونسل لیگ، کنونشن لیگ، قیوم لیگ، نیپ (ولی خان مرکز میں) اور نیپ (بھاشانی اور چوہدری اسلم) کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ ان انتخابات میں اکثریتی جماعتوں کی پوزیشن واضح ہے۔ بھٹو اور مجیب کے علاوہ خان ولی سرحد اور بلوچستان کی بنیاد پر سودا بازی نہیں بلکہ آئین سازی اور دوسرے امور پر بات چیت کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ عوام نے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ کو ناکام بنا کر سیاسی توڑ جوڑ کی راہیں مسدود کردی ہیں۔

تینوں مسلم لیگوں کو متحد کرنے کی کوششوں کے پیش نظر یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ دولتانہ، فضل القادر اور قیوم خان بائیں بازو کی جماعتوں کی کامیابی سے پیدا ہونے والی صورت حال سے عہدہ برا ہونے کے لئے ایک پلیٹ فارم

پیپلز پارٹی کے خلاف مقبوضہ اخبارات شر انگیز مہم چلا رہے ہیں

پر جمع ہو جائیں گے۔ بائیں بازو کا نام صرف آڑ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوب خان کے دور میں ہی یہ کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ قیوم کو کنونشن لیگ کی سربراہی کا لالچ دیا جا چکا تھا۔ دولتانہ صاحب پہ بھی دباؤ پڑا تھا۔ ایوب خان کے بعد ایک بہت ہی طاقتور ہاتھ نے پھر دولتانہ کی کلائی کو مروڑا۔ دولتانہ اسے برداشت نہ کر پائے اور انھوں نے استعفا دے دیا۔ جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تو وہ چپکے سے کونسل لیگ کی کرسی صدارت پر براجمان ہو گئے۔

ان دنوں سیاسی حلقوں میں یہ بات بڑی شدت سے گشت کر رہی ہے کہ عوامی لیگ کو مغربی پاکستان کی ایک سیاسی جماعت کی تائید کے لئے تینوں مسلم لیگوں کو ختم کر دیا جائے گا قیوم خاں، دولتانہ اور فضل القادر چوہدری پاکستان جمہوری پارٹی کے صدر مسٹر نورالامین کی قیادت میں کام کریں گی۔ ایک مسلم لیگ کا نیا سربراہ مشرقی پاکستان کے طلبہ اور عوام کا پرانا دشمن نورالامین ہو گا۔

انتخابات کے نتائج نے عوامی لیگ کے سربراہ کی پوزیشن نمایاں طور پر پیش کر دی ہے۔ وہ بلاشبہ اکثریت سے کامیاب ہوئے ہیں انہیں مشرقی پاکستان کا واحد نمائندہ سیاست دان تسلیم کرنا پڑے گا۔ مجیب کو سیاسی برتری کے لئے مشرقی پاکستان میں اپنی حیثیت برقرار رکھنا پڑے گی۔ اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ ایسے عناصر سے گٹھ جوڑ نہ کریں جو ماضی میں اپنا اقتدار بچانے کے لئے عوام کے خون کی ندیاں تک بہا چکے ہیں۔ ظاہری طور پر ایسے اسباب کا وجود بھی نہیں جو مجیب صاحب کو اتنا مجبور کر دیں کہ وہ "مجبوروں" کے ساتھ اتحاد قائم کر کے اپنی ساکھ کو نقصان پہنچائیں۔

ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت عوامی لیگ کا یہ مسئلہ بجا ہے کہ مشرقی پاکستان کے علاوہ مرکز میں باقی چار صوبوں کی نمائندگی کون کرے گا۔ جبکہ وہ معمولی اکثریت سے حکومت بنانے کے اہل بھی ہے۔ مسٹر بھٹو کے مناسب اور معقول رویئے اور مسٹر مصطفےٰ کھر کے حالیہ دورۂ ڈھاکہ نے بالواسطہ طور پہ مجیب صاحب کو تعاون کا یقین دلا دیا ہے۔ مگر دوسری طرف مغربی پاکستان میں عوامی لیگ کے گمنام سیاست دانوں کے پیپلز پارٹی کے خلاف بیانات مقبوضہ اخبارات نے جس انداز میں شائع کئے ہیں ان سے موقع پرست سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو چانس مل گیا ہے کہ وہ کاروبار سیاست کو فروغ دینے کے لئے مجیب سے رجوع کریں۔ اس رجحان کو تقویت پہنچانے میں لیاری میں مزدور طبقے کے ہاتھوں عبرتناک شکست کھانے والے ایک اجارہ دار سرمایہ دار ڈان اور حریت کے مالکان، مرکزی وزیر مسٹر ہارون کے بڑے بھائی سابق گورنر یوسف ہارون کی ناکام کوششیں بہر طور شامل ہیں اور عامل صحافیوں کے ہاتھوں "ٹکس اپ" کے خوف سے لرزاں معظم علی جھوٹی خبروں کے ذریعے مجیب الرحمٰن کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ بھٹو کچھ بھی نہیں، مغربی پاکستان کے ستر ارکان عوامی لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔ اب اسے دماغ کی خرابی کہئے یا بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کہ معظم علی نے یہ مژدہ بھی سنا دیا ہے کہ پیپلز پارٹی کے بعض ارکان بھی مجیب صاحب سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں کہ انہیں وقت پڑنے پہ امان مل جائے۔

ایک طرف سیاسی شعبدہ باز ہیں اور دوسری طرف شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے مشیران، یہ بات میدان سیاست کے پٹے ہوئے مہروں پر اچھی طرح سے عیاں ہے کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی موجودہ سیاست میں شیخ صاحب کے علاوہ کچھ اور چہرے اور دماغ بھی کارفرما ہیں۔ عوامی لیگ میں سربراہ کو ڈکٹیٹر یا آمر کے اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ مجلس عاملہ پر قمرالزمان اور تاج الدین کی گرفت ضروری ہے۔ اور ان دونوں کا شیخ صاحب کو مکمل اعتماد حاصل ہے۔ لیکن اس حقیقت سے شیخ صاحب اور ان کے رفقائے کار بھی انکار نہیں کر سکتے کہ عوامی لیگ کی مقبولیت اور عوام میں پسندیدگی کی وجہ وہ بنیادی پالیسیاں اور سیاسی طریق کار ہیں جو جناب رحمان سبحان اور ڈاکٹر کمال کے ذہن اور سوچ کی پیداوار ہیں۔ عوامی لیگ نے ہر سطح پر ان کے مشوروں اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اور مشرقی پاکستان کے مخصوص حالات میں ان کے نتائج عوامی لیگ کی بے پناہ مقبولیت کی صورت میں رونما ہوئے ہیں۔

سیاسی شعبدہ باز یہ جانتے ہیں کہ رحمان سبحان اور ڈاکٹر کمال مسٹر مجیب کو ایسا مشورہ نہیں دیں گے، جو عوامی لیگ کو ری پبلیکن پارٹی بنانے میں معاون ثابت ہو۔ اس سے نہ صرف عوامی لیگ کے دائیں بازو کو نقصان پہنچے گا، بلکہ وہ اکثریت لیگ سے بدظن ہو جائے گی، جس کی خواہش پر عوامی لیگ نے سوشلسٹ معیشت کے نفاذ کا اعلان کیا ہے۔ قیوم خاں نے اپنی اسی دانست کی بنیاد عوامی لیگ کے خلاف بیان دے دیا ہے اور جو لوگ یہ جانتے کہ ماضی کا شیر سرحد حال کے شیر پاؤ سے شکست کھانے کے بعد کیا چیز رہ گیا ہے، وہ فوری طور پر کوئٹہ میں ایک اجارہ دار سرمایہ دار کی خان قیوم سے ملاقات کو یاد کریں گے۔ مرکزی کابینہ میں نواب مظفر علی قزلباش کی خاموش سرگرمیوں پہ نظر دوڑائیں گے۔ پیروں، نوابوں اور والیانِ ریاستہائے پاکستان کی قیوم لیگ میں شمولیت کا جائزہ لیں گے اور یہ کہتے ہوئے سنائی دیں گے، کہ ملوں، کارخانوں، بلند عمارات، جاگیروں اور سرمایہ داری نظام کا پہرہ دینے والا خان قیوم ہے اور اس کے کندھوں پر ایک تھری ناٹ تھری کی بوسیدہ بندوق ہے جو یحییٰ خاں کے ٹھاہ کرنے کے باوجود اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

مجیب الرحمان اپنی پارٹی کی پالیسیوں، مشرقی پاکستان کے مخصوص حالات اور دوسری وجوہات کی بناء پر رجعت

باقی صفحہ ۳۶ پر

عوامی لیگ کو
ریپبلیکن پارٹی بنانے
کی سازشیں کامیاب
نہیں ہوں گی

اخباری وڈیروں کو فکس اپ کرنے کا مسئلہ



منہاج برنا

فارسی کی ایک مشہور اصطلاح ہے "گربہ مسکین" یہ اصطلاح ان عادی مجرموں پر صادق آتی ہے جن کے ہاتھوں سے لہو ٹپکتا ہے لیکن اس کے باوجود خود کو معصوم ظاہر کرنے سے باز نہیں آتے اور جو عادی چوروں کی طرح قانون کے ہاتھوں سے بچنے کے لئے چور چور کے نعرے لگاتے بھاگتے رہتے ہیں۔ کچھ یہی صورت حال مغربی پاکستان کے رجعت پسند پریس کے ان "ناخداؤں" کے ساتھ اس وقت پیش آئی ہے جب پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے انتخابات جیتنے کے بعد ان کی بدعنوانیوں کا احتساب کرنے کا اعلان کیا ہے۔

زیڈ اے بھٹو صاحب نے اس سلسلے میں اپنی فکس اپ کی مخصوص اصطلاح استعمال کی ہے جو بعض وجوہ کے سبب صحافت کے ان ناخداؤں کو بڑی ناگوار گزرتی ہے۔ یہ وجوہ بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہیں اس ناگواری اور ناپسندیدگی کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ان کا احتساب کرنے کی ایک ہلکی سی دھمکی کا عنصر غالب ہے۔ جبکہ ناپسندیدگی کی دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ آئندہ آزادیٔ صحافت کے نام پر وہ عوام کو گمراہ کرنے، جھوٹ و افترا پھیلانے، کذب بیانی کرنے اور بے تکے پراپیگنڈے کے اصنام تراشنے کے لئے آزاد نہ رہیں گے۔ یہ اصحابِ صحافت، صحافت کی اس آزادی کا جو مفہوم لیتے ہیں وہ بھی بہت واضح ہے۔ ان کی وضع کردہ اس آزادیٔ صحافت کے حق کا اطلاق ان لوگوں پر نہیں ہوتا جو ان سے ذرا سا بھی اختلاف رائے رکھتے ہوں۔ کسی قدر آزاد خیال واقع ہوں۔ یا ان کا تعلق بائیں بازو کی سوچ سے ہو۔

یہ بات یقیناً درست ہے کہ کوئی بھی معقول آدمی صحافیوں بلکہ اخباری اداروں اور خبر رساں ایجنسیوں کے مالکوں تک کو دی جانے والی دھمکیوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں کہ کیا کوئی معقول آدمی اسلام اور نظریہ پاکستان کے مقدس نام پر میکارتھی ازم کی حمایت کر سکتا ہے۔ یا ایک بڑی تعداد میں صحافیوں استادوں اور دوسرے ملازمین کو ملازمت سے نکلوانے کے مطالبوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے؟ اور یا کوئی معقول آدمی مقبول سیاسی رہنماؤں مسٹر بھٹو اور شیخ مجیب الرحمان کو سازشی، اسلام دشمن، تعصب پرست لکھنے کی محض اس لئے حمایت کر سکتا ہے کہ ان کے سیاسی نظریات ان کے مفادات سے ٹکراتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مسٹر بھٹو اور مجیب کے نظریات سے مکمل طور پر اتفاق نہ کرے۔ لیکن یہ حق کسی شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ مذہب کے نام کو غلط طور پر استعمال کرتے ہوئے اپنے ان مخالفین کو کافر اور پاکستان دشمن کے لقب سے نوازے۔

یہ بات ذرا تفصیلی تجزیہ کی محتاج ہے کہ یہ حضرات خصوصاً معظم علی، مجید نظامی، زیڈ اے سلہری اور الطاف حسن قریشی مسٹر بھٹو کی اس بات سے اس درجہ ناراض بلکہ جھنجھلائے ہوئے کیوں ہیں کہ انہیں "فکس اپ" کر دیا جائے گا۔ مسٹر بھٹو انتخابات سے کافی عرصہ پہلے بھی نیشنل پریس ٹرسٹ پر کڑی نکتہ چینی کرتے رہے ہیں۔ اور اس نے ۲۲ اخبارہ داروں اور رجعت پسند سیاسی طاقتوں کی جس طرح علمبرداری کی ہے اس پر تنقید کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے پاکستان پریس انٹرنیشنل اور اس کے مالک معظم علی کے عوام دشمن پراپیگنڈہ اور دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں خصوصاً جماعت اسلامی کی بے جا طرفداری اور حمایت پر بھی کھل کر تنقید کی ہے۔

معظم علی ترقی پسند طاقتوں اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی مخالفت کے سلسلے میں خاصے مشہور ہیں۔ وہ اپنے ادارے کے کارکنوں کا استحصال کر کے چند سالوں میں ایک بڑی ملکیت کے یکا و تنہا مالک بھی بن گئے ہیں۔ اخباری صنعت میں پی پی آئی وہ ادارہ ہے جس کے کارکنوں کے حالاتِ کار دوسرے تمام اداروں کے مقابلے میں ہمیشہ انتہائی خراب رہے

ہیں۔ معظم علی کا یہ دستور رہا ہے کہ اپنے اداروں میں بڑی تعداد میں اپرنٹس بھرتی کر کے ان سے بارہ بارہ اور سولہ سولہ گھنٹے کام لیتے ہیں۔ یہ بے چارے نوجوان جو اس پیشے میں نووارد ہوتے ہیں اپنے حقوق حاصل کرنے کی صحیح جدوجہد سے آشنا نہیں ہوتے۔ انہیں بسا اوقات بغیر کسی اوورٹائم کے ہفتہ واری تعطیلات پر بھی کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ راولپنڈی تک کے دفتر میں جو کہ مرکزی حکومت کی سرگرمیاں بھی کور کرتا ہے یہی صورت حال روا رکھی گئی ہے۔ معظم علی ان ناتجربہ کار نوواردگان کی غلطیوں کی درستگی کے لئے چند سنیئر صحافی بھی ملازم رکھ لیتے ہیں۔ ان میں سے صرف تین چار ایسے ہوتے ہیں جن پر معظم صاحب کی خصوصی نظر کرم ہوتی ہے۔ اور انہیں عملے کے دوسرے ارکان کی نسبت بہتر تنخواہ ادا کی جاتی ہے۔ ان سنیئر صحافیوں سے وہ دوسرے تمام کام بھی لئے جاتے ہیں جو دراصل آجر کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس میں ناتجربہ کار عملے کو کنٹرول میں رکھنے سے لے کر ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی اور عوامی رابطے تک کے سارے کام شامل ہوتے ہیں۔ ان کی اس کارکردگی کے عوض انہیں حکومت یا غیر ملکی اخباری اداروں کے اخراجات پر غیر ممالک کے دورہ پر بھیجنے کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔

ٹریڈ یونین دشمنانہ اور عوامی قوتوں کے خلاف سرگرمیوں کا یہ دائرہ معظم علی نے صرف اپنے ادارے تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ انہوں نے مزدور دشمن اور عوام دشمن اخباری وڈیروں کے رہنما کی شکل اختیار کر لی ہے۔ صحافیوں کی ملک گیر ہڑتال کے موقع پر پی پی آئی کا دفتر مالکوں کی سازشوں کا اصل مرکز تھا۔ اور رجعت پسندوں کے نمائندے نوابزادہ شیر علی خاں کی انہیں پوری حمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ہی معظم علی نے پی پی آئی کو پوری طرح رجعت پسند سیاسی جماعتوں کا ترجمان بنا دیا۔ اور یہ ایجنسی عوام دوست جماعتوں کے خلاف پروپیگنڈہ کا ایک ہتھیار بن کر رہ گئی۔

معظم علی بڑے فخر کے ساتھ مختلف ادوار میں مختلف رجعت پرستوں کا گماشتہ کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ محمد علی بوگرہ، سردار امیر اعظم، اے کے سومار، نوابزادہ نصر اللہ خاں، مولانا مودودی اور ایئر مارشل اصغر خاں ان سب کے مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے معظم علی نے ہمیشہ اپنے ایک نہ ایک رپورٹر کو ان میں سے کسی نہ کسی کی خدمات پر مامور رکھا ہے۔ اپنے ان سیاسی آقاؤں سے اس کے جواب میں وہ اپنی ذات اور ایجنسی کے لئے مختلف قسم کے منافع حاصل کرتے رہے ہیں۔

جہاں تک نیشنل پریس ٹرسٹ کا تعلق ہے اس کے خلاف عوامی نفرت کا ریلا اس کے قیام کے وقت سے ہی بہہ رہا ہے۔ یہ ایوب خاں کے دور آمریت کی پیداوار ہے۔ اور محب وطن صحافی پی ایف یو جے کی قیادت میں ہمیشہ اس کے خلاف آواز اٹھاتے اور اسے توڑنے کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ دوسرے مارشل لا کے نفاذ سے کچھ ہی عرصہ قبل حزب اختلاف کی تمام جماعتوں

راتوں رات چولا

بدل کر سوشلسٹ

بننے والے کون

ہیں

نے جنھوں نے ایک جمہوری مجلس عمل کی تشکیل دی تھی، اسے توڑنے اور اس کے اخبارات کو ان کے اصل مالکوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن مارشل لا نافذ ہونے کے فوری بعد یہ جماعتیں جماعت اسلامی کی قیادت میں اپنا پرانا مطالبہ اور وعدہ فراموش کر کے اخبارات سے ترقی پسند اور عوام دوست صحافیوں کی برطرفی کا مطالبہ کرنے لگیں۔ نوابزادہ شیر علی خاں نے وزیر کی حیثیت سے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے دائیں بازو کی اس سازش کو پوری معاونت فراہم کی۔ اور مغربی پاکستان میں تقریباً ڈیڑھ سو صحافیوں کو ان کی ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا

پورے پریس کو پی ایف یو جے کے خلاف نفرت انگیز مہم چلانے کے لئے استعمال کیا گیا۔ انہوں نے اپنے مکروہ ترین کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے جماعت اسلامی اور پی ڈی پی کی رجعت پسند سیاست کی پوری حمایت کی۔ آزاد خیال اور بائیں بازو کی جماعتوں مثلاً پیپلز پارٹی، نیپ اور عوامی لیگ کے خلاف عوامی رائے عامہ کو ابھارنے کے لئے اپنے ذلیل پروپیگنڈے سے پوری سیاسی فضا کو مسموم کر دیا۔ ان جماعتوں، ان کے منشوروں اور پروگراموں کو اسلام دشمن اور پاکستان کی سالمیت کے منافی قرار دیا۔ بائیں بازو کی ان جماعتوں کے خلاف تشدد کے رجحان کو پروان چڑھایا اور پاکستان کو انڈونیشیا بنانے کی دھمکیاں دینی شروع کیں۔ ان کی اس مہم کی وجہ سے سیکڑوں سیاسی کارکنوں، ٹریڈ یونین کے نمائندوں اور طالب علموں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ اس مہم کو ملک کے بائیس اجارہ دار خاندانوں اور غیر ملکی سامراجی طاقتوں کی پوری شہ اور امداد حاصل تھی۔

ماضی کے اس تمام جائزے کے بعد ہم اب رجعت پسند طاقتوں سے جن میں سب اخباری وڈیرے بھی شامل ہیں یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا تم اس کو تسلیم کرتے ہو کہ تم نے سینکڑوں صحافیوں، ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں اور سیاسی کارکنوں کو فکس اپ کیا تھا؟ یہ تم تھے جنھوں نے پاکستان میں "فکس اپ" کرنے کا کاروبار رچایا تھا؟ اور اب جبکہ عوام نے تمھیں مسترد کر دیا ہے اور تمھاری تمام سازشوں کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے، تو تم اس پر اتنے چراغ پا کیوں ہو کہ عوامی طاقتیں تمھیں تمھارے ماضی کے ان جرائم کے بدلے "فکس اپ" کرنے کا اعلان کر رہی ہیں اور تم نے فکس اپ کرنے کا جو کاروبار پھیلا رکھا تھا اس پر تمھارا احتساب کرنے کی بات کر رہی ہیں۔ بتاؤ کس نے کس کو فکس اپ کیا تھا؟ اب یہ وقت تمھارے جواب دینے کا ہے۔

عوام کے یہ مجرم آج معافی مانگنے میں مصروف ہیں۔ وہ آج جمہوریت، رواداری اور صحافت کی آزادی کی باتیں کر رہے ہیں۔ یقیناً عوام نے ان تمام اقدار کی خاطر جنگ لڑی ہے۔ جمہوریت، رواداری، آزادی صحافت جیسے آئیڈیل حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دی ہیں اور وہ خود بھی اپنے ان آئیڈیل کی حفاظت کریں گے لیکن تمھارا کیا ہوگا جنھوں نے ان آئیڈیل کی خاطر جنگ کرنے

باقی صفحہ ۴۲ پر

اب کیا ہوگا؟ —— سیاسی تجزیہ



مقبوضہ اخبارات نے مجیب کا حُلیہ بگاڑ دیا ہے

وقائع نویس

اِن دنوں عام آدمی کی زبان پر صرف ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ ؛-

اب کیا ہوگا؟

یہ سوال بظاہر بہت مختصر ہے لیکن اس کی گہرائی کا اندازہ لگانا ناممکن نہ سہی تاہم مشکل ضرور ہے۔ مغربی پاکستان میں حکمران ٹولے، مقبوضہ اخبارات، خبر رساں اداروں اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع نے مشرقی پاکستان کے بارے میں شیخ مجیب الرحمان کی جو تصویر انتخابات سے پہلے پیش کی۔ اس میں ایک ایسی شخصیت کو روشناس کرایا جو مغربی پاکستان کی بدترین دشمن ہے، آزاد بنگال چاہتی ہے۔ بھارت سے دوستی کو عزیز رکھتی ہے۔ اس شخصیت نے چھ نکات کو جنم دیا۔ چھ نکات کا مقصد دو پاکستان قائم کرنا ہے۔ کرنسی الگ، فوج الگ، خارجہ پالیسی الگ، مشرقی پاکستان ایک علیٰحدہ ملک اور مغربی پاکستان ایک غیر ملک۔

یہ شخصیت پاکستان کو ختم کرانا چاہتی ہے۔ اس پاکستان کو جس کے لئے ہم نے لاکھوں جانیں قربان کی ہیں جو اسلام کا ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے۔ جو مسلمانوں کی پانچویں بڑی مملکت ہے۔

اگرتلہ سازش کا مرکزی کردار بھی یہی شخصیت ہے۔ یہ سازش پاکستان کو ختم کرنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ اس میں سابق فوجی اور سول سروس کے ملازمین بھی شامل تھے۔ سازش کامیاب ہو جاتی تو مشرقی پاکستان الگ ہو جاتا۔

مغربی پاکستان کے عوام کے ذہنوں میں آج بھی اسی مجیب الرحمان کی تصویر ہے۔ انہیں قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ایک ہزار میل کے فاصلے پر ملک کے دوسرے حصے سے واقفیت کا ذریعہ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہیں، سوان پر قبضہ سرمایہ داروں کا تھا۔ ایوب آمریت کو گماشتہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ ایوب خاں نے جہاں نیشنل پریس ٹرسٹ اور مقبوضہ اخبارات کو اپنے تخت و تاج کے لئے استعمال کیا۔ وہاں ان ذرائع نے اپنے اصلی مالکوں کا بھی نمک حلال کیا۔

ویسے تو پاکستان کی پوری تاریخ میں صحافت پابند رہی اور اس سے باندی کا کام لیا جاتا رہا، لیکن ایوب شاہی کے دنوں میں اس کا رہا سہا حلیہ بھی بگڑ گیا۔

ان حالات میں جب کہ گماشتہ سرمایہ دار مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کو دونوں ہاتھ سے لوٹ رہا ہے۔ اور ملکی و غیر ملکی سرمائے کی کھپت کا مرکز مغربی پاکستان کے چند بڑے شہر تھے وہ اس بات کو منظرِ عام پر لانے کی کیوں زحمت گوارا کرتے کہ مشرقی پاکستان میں معاشی بدحالی کے ذمہ دار ہم ہیں۔ بھوک اور افلاس کا راج ہماری وجہ سے قائم ہے۔ روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور طبی سہولتیں مانگنے والوں کے سینے ہمارے اشاروں پر چھلنی کئے جاتے ہیں۔ خون کی ندیوں کی روانی ہماری محتاج ہے۔ قوم کی بیٹیاں ہمارے معمولی سے حکم پر متاعِ عزیز لٹا دیتی ہیں۔ ہم قاتل ہیں، ہم راہزن ہیں، ہم لٹیرے ہیں، مشرقی پاکستان صحیح چیخ رہا ہے۔

مقبوضہ اخبارات اور حکومتیں مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک دوسرے کا اٹوٹ انگ ثابت کرتے کے لئے عوام کے مذہبی جذبات کو اچھالتی رہیں۔ کہ اسلام دونوں حصوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے جو علیحدگی کی اجازت نہیں دے گا حالانکہ اس وقت بھی مقبوضہ اخبارات اور حکمران ٹولے نے اسلام کا سہارا اسی طرح لیا۔ جس طرح انتخابات کے دوران۔ ظلم پر پردہ ڈالنے کے لئے بین الصوبائی اتحاد، اردو بنگلہ بول چال، بین الصوبائی شادیاں، طلبہ، اساتذہ اور گانے ناچنے والے حکمران ٹولے کے ترجمان کے وفود کی آمد و رفت کے طریقے اختیار کئے گئے اور ان پر عملدرآمد کے لئے سالانہ لاکھوں روپے کے اخراجات دکھائے گئے۔

ان ہتھکنڈوں سے باخبر کرنا اخبارات کا کام تھا۔ اسے بدقسمتی کہئے کہ ایوب خاں مالکانِ اخبارات کو خریدنے میں کامیاب ہو گئے یا پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (امروز، پاکستان ٹائمز، اسپورٹس ٹائمز) جیسے ادارہ پر شب خون مارا گیا اور اس ادارہ کے بل بوتے پر عنایت اللہ کی صحافت نے "مشرق" کے روپ میں ملک بھر کے مالکانِ اخبارات کو "غلامِ صحافت" کی تقلید کی راہ دکھائی صحافی اخبارات کے مالک نہ تھے۔ جب انہیں نیم سرکاری اداروں کے بابوؤں کی طرح کام کرنے کے لئے مجبور کیا گیا تو وطنِ عزیز میں یہ فخر بھی صحافیوں کو حاصل ہوا کہ انہوں نے مارشل لاء کی جھلسا دینے والی بھٹی کے سامنے کھڑے ہو کر آزادئ رائے اور آزادئ تحریر کا نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

عنایت اللہ کی صحافت نے "مشرق" کے روپ میں "غلام صحافت" کا نمونہ پیش کیا

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے ارکان نے قوم کو سیاستدانوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے بحالیٔ جمہوریت کے لئے ایک اہم فریضہ انجام دیا۔ صحافیوں کی یہ جدوجہد ایسے کٹھن مراحل میں جاری رہی جب کہ آج کے اسلام پسند اور ماضی کے نام نہاد مقتدر اور ممتاز سیاستدان ایوب خاں سے ڈر کر اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ اس جرأتِ رندانہ کی پاداش میں صحافیوں کو کڑی سزائیں بھگتنا پڑیں۔ صحافی رہنماؤں کے تبادلے غیر ممالک میں کر دیئے گئے۔ انہیں مختلف انداز میں ذہنی اذیتیں پہنچائی گئیں، لیکن قابلِ صد ستائش ہے، پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کہ اس نے صحافیوں کے لئے بہتر روزگار، بہتر معیارِ زندگی اور مراعات حاصل کرنے کی بجائے آزادیٔ صحافت کا علم اونچا رکھا۔ ایوب آمریت کے آخری ایام میں جب کہ ملک کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے مظلوم عوام اپنی مشکلات کے حل کے لئے سڑکوں پر نکل آئے تھے، اس وقت بھی صحافیوں کی انجمن نے پریس کی آزادی کے لئے اپنی کوششیں وقف کیں اور صحافیوں کے معاشی مسائل کی طرف توجہ نہیں دی۔

ایوب گئے اور یحییٰ صاحب برسرِ اقتدار آئے تو صحافیوں کے لئے ایک اور آزمائش آن پڑی۔ قلمدانِ وزارتِ اطلاعات ایک ایسے شخص کے ذمے دیدیا گیا جو سیاسی طور پر سامراجی ذہنیت اور سامراج پسند سیاسی جماعتوں کا مربی ثابت ہوا۔ اس نے اپنے دورِ اقتدار میں مالکانِ اخبارات کو اپنے انداز میں شکنجے میں لیا اور جو کام ایوب خاں کے دورِ اقتدار میں نہ ہو سکا تھا وہ اب ہو گیا اور مالکانِ اخبارات نے ایسے صحافیوں کو ملازمتوں سے برطرف کر دیا جو سامراج دشمن تھے۔ ملک بھر میں پہلی بار صحافیوں کا اتنا بڑا معاشی قتلِ عام ہو چکا تو "غلام صحافت" نے مقبوضہ اخبارات کا روپ دھار لیا۔ اپریل ۱۹۷۰ء سے لے کر ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء تک ان اخبارات نے عوام دوست طاقتوں کے خلاف جو گل کھلائے وہ بدترین صحافت، بددیانتی کے اعلیٰ ترین نمونے اور جھوٹ کے پلندوں کے بے مثال کارناموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طوفان بدتمیزی میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مقبول ترین سیاسی رہنماؤں کا عوامی تصور بگاڑنے میں جو ممکن ہو سکا، اس سے ہرگز گریز نہیں کیا گیا...

اب لیجئے، انتخابات کے بعد صورتِ حال۔ مقبوضہ اخبارات ذرائع نشر و اشاعت اور خبر رساں اداروں میں سے بالخصوص پی پی آئی نے مسٹر بھٹو اور مسٹر مجیب کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مسٹر بھٹو کے خلاف عوامی لیگ کے چھٹ بھیوں کے بیانات صفحۂ اوّل پر نمایاں طور پر شائع کئے۔ اندرونی صفحات پر تو اس قسم کے بیانات کو سب سے زیادہ نمایاں طور پر شائع کرنے کا انتظام کیا گیا۔ دوسری طرف مسٹر بھٹو کے پبلک جلسوں اور پریس کانفرنسوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ اخبارات نے یہ رویہ محض اس لئے روا رکھا ہے کہ مالکان اخبارات اجارہ دار سرمایہ دار ہیں۔ پاکستان کے سب سے بڑے انگریزی اخبار ڈان اور اس کے علاوہ حریت، ڈان گجراتی اور وطن گجراتی پر ۲۲ خاندانوں کے سیاسی باوا ہارون خاندان کا تسلط ہے۔ پاکستان کے سب سے بڑے اردو اخبار جنگ کا مالک میر خلیل الرحمان مختلف بنکوں کا ڈائریکٹر اور صنعتی اور کاروباری کمپنیوں کا حصہ دار ہے۔ اس کے علاوہ جو اخبارات قابل ذکر ہیں۔ وہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے ہیں اور نیشنل پریس ٹرسٹ ایوب خان کے اشارے پر ملک کے اجارہ دار سرمایہ دار نے قائم کیا تھا یعنی اس میں بھی بائیس ۲۲ خاندانوں کا مال لگا ہوا ہے۔

ان اخبارات سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ان سیاسی جماعتوں کا ساتھ دیں گے جو اجارہ داروں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف ہیں، اصولی طور پر غلط ہوگا۔ یہ اخبارات اپنا تاریخی کردار پیش کر رہے ہیں اور اپنے طبقے کے مفادات کے تحفظ کے لئے سودا بازی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ عمل یقیناً احمقانہ ہے کہ انتخابات سے پہلے انہوں نے جو کچھ کیا، عوام نے اسے قبول نہیں کیا اور اپنے طبقے کے مفادات کا خیال کرتے ہوئے ان سیاسی جماعتوں کو کامیاب بنایا جو عوام دوستی کا دم بھرتی ہیں۔ طبقاتی جنگ شروع ہو چکی ہے۔ وہ لوگ جو نہیں جانتے کہ طبقاتی تضادات کیا ہیں وہ وقتی طور پر سوچنے لگتے ہیں کہ "مجیب صاحب نے تو چھ نکات کی بنیاد پر آئین بنانے کا اعلان کر دیا ہے اور دھمکی بھی دی ہے کہ اسے منظور کرنے میں رکاوٹیں پیدا کیں تو خون کی ندیاں بہہ جائیں گی"۔

ان کے ذہن میں اس سوچ کے ساتھ وہ مجیب نظروں کے سامنے گھومنے لگتا ہے جو مغربی پاکستان کا دشمن ہے بھارت کا ایجنٹ ہے۔ سامراج دوست ہے علیحدگی پسند ہے۔ اس خوفناک اور بھیانک مجیب کا تصور آتے ہی وہ کہہ اٹھتا ہے۔

- :۔ اب ہوگا ؟
- :۔ مجیب تو ڈٹا ہوا ہے ؟
- :۔ بھٹو کا رویہ کیا ہوگا ؟
- :۔ پاکستان کا اللہ مالک ہے !

انہیں یہ بتانے والا کوئی نہیں کہ مجیب نے آزاد بنگال کا نعرہ نہیں لگایا، انہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں عوام کو لوٹنے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد رکھنے والے تمام

بندوق کی وہ گولیاں

جو ظالموں پر چلنی

چاہئیں، مظلوموں

کے سینوں میں

پیوست ہو جاتی ہیں

مخالف قوت کے ہتھیاروں سے زیادہ طاقتور ہتھیار ہونے ضروری ہیں

فرسودہ نعروں اور پراپیگنڈے کی نفی کی ہے۔ مجیب کو مشرقی پاکستان پر کی جانے والی زیادتیوں کا شدید احساس ہے تاہم وہ مغربی پاکستان کے مظلوم عوام سے بھی غافل نہیں۔ ویسے جب دو بھائی الگ الگ گھر بسا کر بھائیوں کی طرح رہ سکتے ہیں اور ایک طرف سے دوسرے پر زیادتی کی صورت میں نفرت کا اظہار کر سکتے ہیں اور رضامندی ہونے پر پھر مل بیٹھتے ہیں تو مجیب کے تلخ و تند لہجے، مشرقی پاکستان کے عوام اور اسی طرح مغربی پاکستان کے عوام پر مظالم کے خلاف آواز اٹھانے اور ناانصافیوں کے تذکرے کو الف لیلوی داستان کا رنگ کیوں دیا جا رہا ہے۔

مجیب صاحب اور بھٹو صاحب پر عوام نے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے صوبوں کے مظلوم عوام کی قیادت کا ذمہ لیا ہے۔ ان سے غلطی ہوئی تو ان کا محاسبہ کرنے والے عوام اپنا تاریخی کردار ضرور ادا کریں گے۔

لہٰذا مجیب صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کہی ڈھاکہ کو یقیناً ظالموں سے نمٹنے کا حق ملنا چاہیے اور مغربی پاکستان کے عوام کو بھی ظالموں کے خلاف جدوجہد جاری رکھنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج عوامی جدوجہد نے آئین سازی کی راہ میں تمام رکاوٹیں دور کر دی ہیں۔ بھٹو اور مجیب کے درمیان متنازعہ امور حل ہو جائیں گے۔ استحصال پسندوں، لٹیروں اور سامراج دوستوں کو پائی پائی کا حساب دینا پڑے گا۔

رہا یہ سوال کہ اب کیا ہوگا؟ تو اس کا اتنا ہی مختصر جواب یہ ہے کہ انتخابات مسائل کا مستقل حل نہیں۔ الفتح اس ضمن میں شروع سے ہی اپنے قارئین کے سامنے یہ مؤقف پیش کر رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اجارہ دار سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کا ملک کے تمام پیداواری ذرائع، پراپیگنڈہ اور اہم اداروں پر مکمل قبضہ ہے۔ وہ بندوق سے لیس ہے۔ جب کبھی مظلوم ان ظالموں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو بندوق کی وہ گولیاں جو ظالموں پر چلنی چاہیں، مظلوموں کے سینوں میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ ۲۳ سال کا عرصہ اس امر کا گواہ ہے کہ مزدوروں پر مظالم ہوئے، انہیں جائز حقوق سے محروم کیا گیا۔ کسانوں کو خوانین، میروں، پیروں اور وڈیروں نے بندوق کی نالی سے کچلا اساتذہ بھی اپنی چمڑی نہ بچا سکے۔ صحافیوں کی کھال ادھیڑ کر رکھدی گئی حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا گولی کا نشانہ ظالم بنتے لیکن تمام قانون اور قانون پر عملدرآمد

منظم اور ہر طور سے مسلح

مزدور کسان ہی ان مسائل

کا حل ہیں ورنہ ایوب آتے رہیں

گے اور بندوقیں ان کی

حفاظت کرتی رہیں گی۔

کرانے والے ادارے ظالموں کے تابع ہیں لہٰذا انصاف نہ مل سکا اور جب تک مزدور کسان راج باضابطہ جدوجہد اور ظالموں کے مدِمقابل بندوق کی نالی کے ذریعے مسلح جدوجہد نہ ہوگی، ظلم بڑھتا چلا جائے گا۔ اسے غیر مسلح مجیب، غیر مسلح بھٹو اور غیر مسلح عوام نہیں روک سکتے۔ ظالم کا مقابلہ صرف اور صرف اس کے ہتھیار توڑنے چھیننے اور ملیا میٹ کرنے کے بعد ممکن ہے اور اس کے لئے مخالف قوت کے ہتھیاروں سے زیادہ طاقتور ہتھیار ہونے ضروری ہیں۔ ورنہ اب کیا ہوگا؟ کا سوال جنم لیتا رہے گا۔

عوام کے منتخب نمائندوں کو اسمبلیوں کی صورت میں اقتدار مل بھی گیا اور انہوں نے انتہائی خلوص اور دیانتداری سے عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے کی طرف توجہ بھی دے دی کارخانوں اور زمینوں کو عوام کی ملکیت قرار دینے کے لئے ضروری اقدامات بھی کر دیئے لیکن اس کی راہ میں ظالموں نے بندوق اٹھالی تو نہتے عوام اور ان کے نہتے رہنما کیا کر پائیں گے۔

ایوب آمریت کے خلاف عظیم عوامی ابھار کے دنوں میں عوام نے ظلم کے خلاف اپنے بھرپور شعور کا مظاہرہ کیا۔ مظلوموں کے خون سے ملک سرخ ہو گیا۔ پولیس کی بندوق کا لوگوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن جب سرحدوں کے محافظ آگئے تو کیا ہوا؟ عظیم عوامی ابھار کے دوران اور اس کے بعد کوئی مل مالک، کوئی وڈیرا، کوئی جاگیردار، کوئی خان، کوئی پیر، کوئی میر، کوئی چوہدری، کوئی خان، کوئی ساہوکار، کوئی ظالم جیلوں یا گولی کی زینت نہیں بنا۔ ایک بھی نہیں۔ جیل جانیوالوں میں عزیز الحسن، ریاض، عثمان بلوچ اور نجانے کتنے اور مزدور رہنما، مزدور کارکن اور جائز حقوق کی جدوجہد میں حصہ لینے والے تھے۔ آج صفدر میر کو بھی اسی جرم کی پاداش میں پابندِ سلاسل کیا گیا۔ شمالی ہشت نگر کے کسانوں کا خون آج بھی بہہ رہا ہے۔ معاشی قتل گاہیں بدستور سجی ہوئی ہیں طلبہ چیخ رہے ہیں مظلوم بلبلا رہا ہے۔

ان تمام مسائل کا حل صرف اور صرف مظلوموں کا ظالموں کے خلاف صف آرا ہونے میں ہے — منظم اور ہر طور سے مسلح عوام، مظلوم مزدور اور کسان ہی ان مسائل حل ہیں۔ ورنہ ایوب آتے رہیں گے اور بندوقیں ان کی حفاظت کرتی رہیں گی اور اب کیا ہوگا؟ ذہنوں پر مسلط رہے گا۔

لہُو کے راستے زرد ہیں

اعجاز گل

رات محکوم رشتوں کے میثاق اُجڑے گھروں کو وراثت میں دے
آفتابی کواڑوں پہ شب خوں نشاں۔ نیم خوابیدہ آنکھوں کا روزن بنے
اور دیوانگی شہر ہو
نفرتیں بزدلی کے احاطوں سے نکلیں
زمیں آسمانوں پہ جوتوں کی بارش کرے
مدرسے کے سیاہ بورڈ پر خاک کی تہہ جمے
شاہراہوں پہ بہتا لہو۔ بے عدالت سزاؤں کے آئین پر آخری ہجر ہو
(کربلاؤں کا زہراب مظلومیت ہے۔)

میں نمناک مٹی سے لپٹوں
پرانے نئے دُکھ سیاہ پیرہن پر علامات دُوں
بے کشش عزتیں، بے ہنر ضابطے پاؤں کی دلدلی انگلیوں پر ترازوں کروں
اور بوسیدہ گرجے کی دیوار پر کوئلے سے لکھوں
"ایفرو ایشیا سُرخ ہے"

***

غزل

سیّد رشید احمد

شبِ غم جتنی گہری جس قدر تاریک ہوتی ہے
سحر کی آمد آمد اس قدر نزدیک ہوتی ہے

مرے جذبات کی یہ کس لئے تضحیک ہوتی ہے
کہ دل ہے اور دل میں کچھ نہ کچھ تحریک ہوتی ہے

نظامِ نوا گر وسعت میں کم بھی ہے تو کیا پرواہ
کہ نورِ صبح کی پہلی کرن باریک ہوتی ہے

مری اک آہ بھی تاثیر بن جائے تو لے جا ہے
تری اک اِک نظر نشتر بھی ہو تو ٹھیک ہوتی ہے

تمھارے در پہ یہ کیا حق طلب کرنا گدائی ہے
سزا جرمِ وفا کی بھی جو مانگوں بھیک ہوتی ہے

یہ دل اس کی صدا عربی نہ عجمی ہے نہ تاتاری
زباں عربی و عجمی ترکی و تازیک ہوتی ہے

رشید اس صورت و معنیٰ کے دُنیا سے گریزاں ہے
کہ جتنی کیجیے تحقیق وہ تشکیک ہوتی ہے

ماہرین اقتصادیات نے اسٹیٹ بنک کی اس مالی پالیسی کو عوام دشمن سازش سے تعبیر کیا ہے

اعجاز غنی

اسٹیٹ بنک نے نومبر ۷۰ میں

ایک ارب کی مالیت کے نئے کرنسی نوٹ جاری کئے

تئیس سال کے درمیان پاکستان میں قائم ہونے والی ہر حکومت نے سرمایہ دارانہ نظام کی آبیاری کی اور اسے خونخوار بنانے میں ہر ممکن قانونی ضمانت دی۔ اب یہ نظام عوام کا خون چوس کر کافی توانا ہو چکا ہے اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے بڑے حوصلے اور سخت رویے کی ضرورت ہے۔ اکثریت سے کامیاب ہونے والی دو پارٹیوں کے اقتصادی پروگرام سے سہم کر پاکستان کے وہ سرمایہ دار جن کا پورے ملک پر بالواسطہ یا بلاواسطہ کنٹرول ہے، قائم ہونے والی نئی حکومت کو غیر مؤثر بنانے کے لئے اپنا حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ وہ اس وقت تک جاری رکھنا چاہتے ہیں جب تک انہیں آئینی طور پر لوٹ کھسوٹ کی کھلی چھٹی نہ دی جائے اور اسی سیاسی "بلیک میلنگ" کے لئے اس طبقہ نے بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

ان اجارہ داروں نے انتخابات سے قبل ایسی اقتصادی پالیسی وضع کی جس سے سارے ملک میں تمام اشیائے ضروری کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ یہ پالیسی دراصل جمہوری نظام اور منصفانہ معاشرہ کے قیام کے خلاف ایک دھمکی تھی۔ انتخابات کے بعد روزمرہ اجناس کی قیمتیں گرنے کی بجائے اوپر چڑھنے لگی۔ متوسط طبقہ، کسان اور مزدور اس ہوشربا گرانی کی چکی میں پس رہے ہیں لیکن حکومت کی مشینری اس کے سدباب کے لئے کوئی سخت اقدام نہیں کر رہی ہے۔ انتخابات میں ناکام ہونے والی جماعتیں خوش ہیں کہ سرمایہ داروں کا عوام پر عتاب نازل ہوا ہے۔ آج تک ان رجعت پسندوں نے گرانی اور نئی اقتصادی پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی کیونکہ وہ لوٹ کھسوٹ کے پروردہ ہیں۔

ایک اطلاع کے مطابق پندرہ دنوں کے درمیان" ۵ نومبر تا ۲۰ نومبر اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے بہتر کروڑ روپے کے نئے کرنسی نوٹ جاری کر دیئے اور جبکہ پورے نومبر میں ایک سو کروڑ روپے کے نئے کرنسی نوٹ جاری کئے گئے ہیں۔ وہ لوگ جن کے روپے بنکوں میں جمع ہیں دھڑا دھڑ روپے نکال رہے ہیں۔ اور روپے نکالنے کا رجحان تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے ماہرینِ اقتصادیات کے بیان کے مطابق ۲۲ سال کے عرصے میں بینک سے روپے نکالنے کی ایسی رفتار کبھی نہیں ہوئی تھی۔ باوثوق ذرائع کا کہنا ہے کہ گزشتہ نومبر میں اسٹیٹ بنک نے ۱۰۰ کروڑ روپے جاری کئے اور اس طرح روپے کا پورا سرکولیشن ۴۰۰ کروڑ سے بڑھ کر ۴۸۰ کروڑ روپے تک پہنچ گیا۔ ایک ماہ کے عرصہ میں ۱۰۰ کروڑ روپے کا جاری ہونا پاکستان کی مالی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی مثال ہے۔

ماہرینِ اقتصادیات اس بات کے ہمنوا ہیں کہ عام طور پر نتائج کی پرواہ کئے بغیر کثیر تعداد میں روپے اس وقت جاری کئے جاتے ہیں جب کوئی قوم حالتِ جنگ میں ہوتی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی اس وقت اسٹیٹ بنک نے زیادہ روپے جاری کئے تھے۔ کیونکہ حالتِ جنگ میں چند وجوہات کے پیشِ نظر ایسی مالی پالیسی ناگزیر ہوتی ہے۔ تاہم اسٹیٹ بنک نے قومی آزمائش کے وقت پندرہ دنوں میں ۱۵ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ جاری کئے تھے۔ ان اقتصادی ماہرین نے اسٹیٹ بنک کی اس مالی پالیسی کو "سازش" سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ مارکیٹ میں روپے کی سخت مانگ ہے اور اس مانگ کی روشنی میں ایک ارب روپے جاری کئے گئے ہیں لیکن اس کے برعکس اقتصادیات

بین الاقوامی سامراجی سازش کے تحت سرحد پار علاقوں میں پاکستانی کرنسی کی طلب بڑھا دی گئی ہے

کا عام اصول یہ ہے کہ روپے کی مانگ اس وقت بڑھتی ہے جب اسی تناسب سے اقتصادی سرگرمیاں (ECONOMIC ACTIVITIES) ہوں یا پھر زرمبادلہ کی آمدنی میں اضافہ ہو لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان دو عناصر میں سے کوئی بھی عنصر اس وقت موجود نہیں بلکہ اس کے برعکس اقتصادی کاموں کی رفتار تیزی سے گھٹتی جارہی ہے۔ صنعتی پیداوار میں دن بدن کمی ہوتی جارہی ہے۔ اور عام تجارت مائل بہ انحطاط ہے۔ بحیثیتِ مجموعی پورے نومبر میں مشرقی پاکستان کی طوفان سے تباہی اور پورے پاکستان کی انتخابی مہم نے اقتصادی زندگی کو بری طرح متاثر کیا جو اقتصادی تعطل Economic disruption) کی شکل میں رونما ہوا ہے۔ حکومت کے مالی اداروں کے ماہرین نے ایسی اقتصادی پالیسی کس سیاسی منصوبے کے تحت وضع کی ہے؟ یہ ابھی تک پردۂ راز میں ہے۔

تاہم اقتصادی ماہرین کا انکشاف ہے کہ لوگ دھڑا دھڑ بنکوں سے اپنے ڈپازٹ (DEPOSITS) اس لئے نکال رہے ہیں کہ غیر یقینی حالات کا بہانہ بنا کر ملک کے اقتصادی نظام کو تباہی کے دہانے پر لے جائیں بڑے بڑے کاروباری یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ جیتنے والی جماعتوں کے پروگرام کے مطابق بنکوں، انشورنس کمپنیوں، بنیادی اور بھاری صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینا چاہتے ہیں۔ اپنے خیال کے مطابق یہ طبقے اس لئے بنکوں سے روپے نکال رہے ہیں کہ وہ اپنے سرمایہ کو محفوظ کر سکیں۔ اور عوامی عتاب سے بچ سکیں۔

دریں اثناء وہ لوگ جن کے روپے کثیر تعداد میں بنکوں میں جمع ہیں ملک کے "ایک خاص" حصہ سے نکال کر اپنے قبضہ میں لے جارہے ہیں اور اپنے سرمایہ، اثاثہ اور اپنی جائداد نقدی (CASH) میں تبدیل کرنے کے بعد رقم کو ملک کے دوسرے خطہ میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس ہیر پھیر سے کسی کو گمان نہیں ہوگا کہ وہ اپنا سرمایہ اور اثاثہ دوسرے خطہ میں منتقل کر رہے ہیں۔ یہ بات یہاں وضاحت طلب ہے کہ کسٹمز (CUSTOMS) کے عام قانون کے مطابق اس خطہ سے دوسرے خطہ میں روپے لے جانے کی کوئی خاص ممانعت نہیں ہے۔ اگر کوئی چاہے تو روپے سے بھری ہوئی بوریاں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان لے جاسکتا ہے۔

اقتصادی نکتے کو سمجھنے والے کا تیسرا شبہ یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے سرحد پار علاقوں میں پاکستانی کرنسی نوٹوں کی مانگ بڑھ گئی ہے اور اسی مانگ کو پورا کرنے کے لئے یہ لوگ بنکوں سے روپے نکال رہے ہیں تاکہ ان کا سرمایہ کسی نہ کسی صورت میں محفوظ رہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ بین الاقوامی سازش کے تحت چند مخصوص مغربی سامراج ملکوں نے روپے محفوظ کرنے کا بندوبست کیا ہے تاکہ پاکستان کی دو ترقی پسند جماعتیں مالی طور پر ناکارہ بن کر آئندہ حکومت سنبھالیں اور نتیجہ میں مالی بحران کا شکار رہیں۔ مشرقی پاکستان کے سرحد پار جن علاقوں میں پاکستانی کرنسی نوٹوں کی مانگ بڑھ گئی ہے ان کا پتہ تادمِ تحریر نہیں چل سکا ہے البتہ ایک غیر مصدقہ اطلاع کے مطابق مغربی پاکستان کے سرحد پار جن علاقوں میں پاکستانی روپے کی مانگ بڑھ گئی ہے ان میں ایران، افغانستان دوبئی، دہبئی اور مشرقی وسطیٰ کے وہ خطے قابل ذکر ہیں جہاں برطانوی اور امریکی سامراج کے اثر و رسوخ ہیں اور وہاں کے اقتصادی رشتے ان مغربی ممالک سے منسلک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مبینہ طور پر مغربی پاکستان سے روپے کالے بازار کے ذریعہ ان متذکرہ علاقے میں منتقل کئے جارہے ہیں اس

نتائج کی پرواہ کئے

بغیر کثیر تعداد میں

کرنسی نوٹ اسوقت

جاری کئے جاتے ہیں

جب کوئی قوم

حالتِ جنگ میں ہو

قومی جرم سے یا تو سرکاری متعلقہ حکام بے خبر ہیں یا وہ خود اس میں شریک ہیں۔ بہرحال: دونوں صورتوں میں متعلقہ حکام کی ذمہ داری ہے کہ ملک دشمنوں کا قلع قمع کریں۔

مارکیٹ میں روپے کی مانگ کے عناصر جو بھی ہوں لیکن اسٹیٹ بینک نے جس سرعت سے نئے کرنسی نوٹ جاری کرنے شروع کئے ہیں۔ اس سے پورا مالی اور اقتصادی ڈھانچہ بحران کا شکار ہو جائے گا۔ اور ہمارے لئے بڑا تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس کا فوری اثر اشیائے خوردنی اور دوسری ضروری اشیاء کی قیمتوں میں مزید اضافہ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اس سے قبل اسٹاک ایکسچینج کے حصص کے دام گر گئے ہیں، اسٹاک مارکیٹ میں شدید بحرانی کیفیت طاری ہے۔ یہ بھی الزام لگایا جاچکا ہے کہ نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ (NIT) اور انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان (ICP) کے چند بااثر افسران جان بوجھ کر ایسی ترکیب کر رہے ہیں۔ جس سے اقتصادی زندگی میں غیر یقینی فضا قائم ہو جائے۔ اور عوام کے منتخب نمائندے اس اقتصادی بحران کے دلدل میں پھنس کر لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقہ کو پناہ دینے کے لئے قانونی ضمانت دے سکیں یا پھر وہ کمزور اور غیر موثر حکومت تشکیل دے کر عوام سے کئے گئے وعدے پورے نہ کر سکیں۔ یہ دونوں ملک میں سرمایہ کاری کے بہت بڑے ادارے ہیں۔ لیکن اس نیم سرکاری ادارے پر دراصل مفاد پرست سرمایہ داروں کا کنٹرول ہے اور ان کے مفاد کے لئے ان اداروں کے افسران سرمایہ داروں کی سازش میں شریک ہیں۔

عوام کے خلاف سازش کا دوسرا ثبوت کراچی ایوان و تجارت وصنعت کے سابق صدر مسٹر یوسف ایچ شیرازی کا وہ بیان ہے جس میں انہوں نے نئی اقتصادی پالیسی کا مطالبہ کیا ہے تاکہ ملک کے سرمایہ دار اس پالیسی کی روشنی میں تجارتی اور مالی منصوبہ بندی کر سکے۔ مسٹر شیرازی نے دراصل اس مطالبہ کے پس پردہ اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ اگر سرمایہ داروں کو ضمانت نہ دی گئی تو ملک کا موجودہ اقتصادی بحران شدید ہو جائے گا۔

خانقاہِ اچھرہ کے پیر مودودی نے بھی ملک کی گرانی

سرمایہ دار اور نوکر شاہی اپنی شکست کا انتقام لینا چاہتی ہے

پر مگرمچھ کے آنسو بہائے ہیں۔ لیکن ان کے بیان کو غور سے پڑھنے کے بعد جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ملک میں بڑھتی ہوئی گرانی کا سدِّباب نہ کیا جاسکا تو اس کی ذمہ داری ان پارٹیوں پر عائد ہوگی جنہوں نے عوام سے ان کی خوشحالی کے وعدے کئے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ ناکامی کی صورت میں یہ پارٹیاں عوام کے انتقام سے نہ بچ سکیں گی۔ مولانا محترم گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کے حامی ہیں اب تک ان پارٹیوں نے نہ تو آئین مرتب کیا ہے اور نہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے ایسی صورت میں مولانا کا عوام کو ورغلانہ دوسرا فتنہ ہے مفکرِ اعظم سرمایہ داروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کی بجائے ان پارٹیوں کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں جنہوں نے نہ اب تک آئین کی تشکیل کی ہے اور نہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے۔

مشرقی پاکستان میں روزمرہ کی چیزوں میں اب تک ۳۵ فی صد کا اضافہ ہو چکا ہے اور اگر اس کا سدِّباب نہ کیا گیا تو مزید اضافہ کی توقع ہے۔ بے روزگاری دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ یہ تمام باتیں اس امر کی تصدیق کرتی ہیں کہ ملکی اور غیر ملکی سطح پر عوام کے خلاف ایک سازش کی جارہی ہے تاکہ تجارت جو پہلی بار پاکستان میں شکست کھا چکی ہے اسکا انتقام لیا جاسکے۔ اس سازش میں وہ افراد اور وہ جماعتیں بھی کسی نہ کسی عنوان سے ملوث ہیں جو انتخابات میں بُری طرح ناکام ہو چکی ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہمارے دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے رہنما اور مولوی صاحبان جو قوم اور ملک کے غم میں برساتی مینڈک کی طرح ٹرٹراتے رہتے تھے۔ اس عوام دشمن پالیسی کے خلاف ضرور صدائے احتجاج بلند کرتے۔

ہمارے ان سیاست دانوں کے رویہ نے خود ان کو عوام کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے اور عوام یہ سوچنے لگے ہیں کہ یہ لوگ ہی دراصل ملک و قوم کے لئے مضر رساں ہیں دوسری طرف باشعور افراد اب عام طور پر کہتے سنائی دیتے ہیں کہ تمام برائیوں کی ذمہ داری ذاتی ملکیت پر ہے اور اس کی کمر توڑنے کے لئے اجارہ دار سرمایہ داروں کی سرکوبی نہایت اہم ہے۔ اس مہم کو تیز کرنے کے لئے ہمیں دو طرفہ جنگ کرنی پڑے گی۔ اسمبلی کے اندر منتخب نمائندوں کو قانونی طور پر اجارہ دار سرمایہ دار کے دائرہ اثر و رسوخ کو کم کرنا ہوگا اور دوسری طرف عوامی سطح پر منظم جدوجہد کرنی پڑے گی تاکہ ان منافع خور انسان دشمن قوتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جاسکے۔

جنوبی ویت نام میں چودہ سال تک کی
امریکی جنرل ایک دوسرے کے کان میں



ویت نام کا نام جہنم آج بھی دہکا ہوا ہے۔
اس جہنم میں چیختی ہوئی ہڈیوں کی گونج اور جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بو تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہر جگہ سے، حتیٰ کہ امریکہ میں بھی جس کے برآمد کردہ بہت سے سفید چمڑی والے فوجی اس آگ میں بھسم ہو چکے ہیں۔ اس جنگ کے خلاف نفرت کے انتہائی جذبات کا اظہار ہو رہا ہے۔ امریکہ میں امریکی پرچم جلائے جا رہے ہیں۔
"امریکی بھیڑیو ویت نام سے نکل جاؤ" کا نعرہ جنوبی ویتنام کے ان کرائے کے فوجیوں کے دلوں کی دھڑکن بھی بن چکا ہے جو اپنے امریکی آقاؤں کے اشارے پر ویت کانگ کے ان جیالوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ جنہوں نے امریکہ کی فوجی آمریت کا بت توڑ کر رکھ دیا ہے

جنوبی ویت نام کے یہ فوجی جن کی پوری نسل امریکہ نے اس جنگ میں کھیت دی ہے اپنی ساری توانائیاں اس جنگ کو فراہم کر چکے ہیں۔ امریکہ نے اس جنگ میں ان کی پوری نئی نسل کو جھونک دیا ہے چودہ سال تک کی عمر کے

امریکی بھیڑیو
ویت نام سے نکل جاؤ

ر کے لڑکے کے ہاتھ میں امریکی ساخت کی رائفلیں تھما دی گئی ہیں۔ لیکن
سرگوشی کرتے ہیں کہ یہ سست نکمّے اور بزدل لڑنے کے قابل نہیں بن سکتے

ت شاد



لڑکے کے ہاتھ میں امریکی ساخت کی رائفلیں تھما دی گئی ہیں۔ لیکن انہیں تربیت دینے والے امریکی جرنل ایک دوسرے کے کان میں بڑی ناگواری کے ساتھ سرگوشی کرتے ہیں کہ "یہ سست، نکمے اور بزدل جن پر ہم لاکھوں خرچ کرتے ہیں لڑنے کے قابل نہیں بن سکتے۔" لیکن اس کے باوجود ویت کانگ سے لڑنے والی اتحادی فوج کے مرنے والوں میں پانچ میں سے چار جنوبی ویت نامی ہوتے ہیں۔ ایک امریکی مبصّر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ہم نے اپنی ایشیائی پالیسی کا سارا بوجھ نوجوان جنوبی ویت نامی کے نازک کاندھوں پر ڈال دیا ہے اور پھر اس خوش فہمی کا شکار ہو بیٹھے ہیں کہ وہ ہمارے جانے کے بعد شمالی ویت نامیوں اور ویت کانگ گوریلوں کا قتلِ عام جاری رکھ سکے گا۔"

امریکہ ویت نام سے اپنی فوجوں کی واپسی کے اعلانات میں صداقت کا رنگ بھرنے کے لئے جنوبی ویت نام کے فوجیوں کو جدید ترین آلاتِ حرب سے مسلح کرکے انہیں جنگ کے نئے داؤ پیچ سکھانے اور ویت کانگ کی گولیوں سے بچنے کے طریقوں کی تربیت دے رہا ہے۔ لیکن تربیت پانے والے ان جنوبی ویت نامیوں کا یہ حال ہے کہ ہر وقت انجانی طرف سے آنے والی گولیوں سے ان کے دل دھڑکتے رہتے ہیں۔ جنوبی ویت نام میں ایک جنگل میں جہاں انہوں نے اپنی مختلف شاخوں کے ہیڈکوارٹر بنائے تھے اب سارے درخت کٹوا دیئے ہیں ایک امریکی فوجی مشیر سے جوان ہرے بھرے اور مضبوط درختوں کی کٹائی کے کام کی نگرانی کر رہا تھا ایک امریکی صحافی نے ان کی کٹائی کا سبب پوچھا تو اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"یہ جنوبی ویت نامی فوج کے ایک جرنل کے حکم کی تعمیل ہو رہی ہے انہوں نے اس سلسلے میں یہ جواز پیش کیا تھا کہ ہیڈکوارٹر کے فوجی کسی بھی وقت جنگل کے بارے آنے والی مارٹر توپوں کی "گنگناہٹ" کا شکار ہو سکتے ہیں لہٰذا ان کے بچاؤ کے لئے جنگل کی کٹائی ضروری ہے۔"

جنوبی ویت نام کے ان فوجیوں کے ہاتھوں میں ایک تھوڑی سی مدت کے بعد نئی ساخت کی امریکی رائفل پہنچ جاتی ہے۔ لیکن وہ جنگ جس میں اب تک ان کی نئی دہائیاں صرف ہو چکی ہیں اسی طرح جاری و ساری ہے۔ آج کے جنوبی ویت نامی سپاہی کے ہاتھ میں امریکہ کی جدید ترین ایم۔۱۶ قسم کی رائفل ہے لیکن کٹھ پتلی کی طرح نچانے والے امریکیوں کے ساتھ لڑائی لڑتے ہوئے ان کی ایک نسل اس قدیم جنگ میں بوڑھی ہو گئی ہے۔

امریکیوں کے ہاتھوں آج نئے سرے سے تربیت پانے والے یہ ویت نامی فوجی امریکی ماہرین کے ہاتھ میں ایک ایسا کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ جسے وہ جس طرح چاہتے ہیں



جیالے ویت کانگ اُن کے لیے موت کی علامت بن گئے

استعمال کرتے ہیں کبھی ان کے سروں پر ہیلمٹ سجا کر انہیں میدانوں میں اس طرح صف آرا کرتے ہیں جیسے شمالی ویت نام کی فوجیں قدیم جنگوں کی طرح طبلِ جنگ بجاتی ہوئی ان پر حملہ کرنے آئیں گی۔ اور وہ ان کا دفاعی حصار بنیں گے۔ اور پھر جب ویت کانگ ان امریکی بھیڑیوں اور ان کے پالتو فوجیوں پر بجلی بن کر ٹوٹتے ہیں تو اپنے زخم ٹٹولتے ہوئے امریکی ماہرین اپنی جھنجلاہٹ کا نشکار شمالی ویت نام کی شہری بستیوں۔ ہسپتالوں اور اسکولوں کو بناتے ہیں جواب امریکی بمباری کی عادی ہو چکی ہیں۔ اور دوسری طرف جنوبی ویت نام کے فوجیوں کی دوبارہ صف آرائی کرکے ان کے ہاتھوں میں نئی ساخت کی رائفلیں تھما کر کارآمد بنانے کی کوشش کرتے ہیں: لیکن اس تمام عمل میں ایک امریکی مرتا ہے تو جنوبی ویت نام کے چار آدمی ہلاک ہو چکے ہوتے ہیں۔

امریکی جنوبی ویت نامی فوجیوں کے اس نکمے پن یا بزدلی کا ذمہ دار ان فرانسیسی ماہرین کو ٹھہراتے ہیں جو ۱۹۵۶ء کے اوائل تک ان کی فوجی تربیت کرتے رہے ہیں۔ ایک امریکی فوجی ماہر کہتا ہے کہ ہم نے جنوبی ویت نامیوں کو گوریلا جنگ کے لئے تربیت نہیں دی تھی۔ بلکہ اس مروجہ جنگ کے تیار کیا تھا جو ہم دوسری جگہوں پر بھی لڑتے رہے ہیں۔ لیکن ویت کانگ گوریلوں کے سامنے یہ ساری تربیت اکارت گئی —— ایک اور امریکی فوجی ماہر نے جنوبی ویت نام کی فوجیوں کی نااہلی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم نے انہیں (جنوبی ویت نامیوں کو) اپنا ہم شبیہہ بنانا چاہا اور یہ ہماری ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ وہ باہر سے امریکی نظر آتے تھے۔ امریکی ہیلمٹ، امریکی کارتوسوں کی امریکی پیٹیاں باندھے اور امریکی رائفلیں ہاتھوں میں تھامے، ان کی ہر ظاہری ادا امریکی تھی لیکن اندر سے وہ ویت نامی کے ویت نامی تھے۔

جنوبی ویت نامی فوجیوں کی نااہلی اور بزدلی امریکی فوجی ماہرین کے لئے ہمیشہ ایک بحث طلب مسئلہ رہی ہے۔ ویت نامی فوجی اس تمام عرصے میں امریکی فوجیوں کی حقارت کا جس قدر شکار رہے ہیں وہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ امریکی افسران انہیں ہر طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ انہیں گالیاں تک دینے سے باز نہیں آتے لیکن محاذِ جنگ پر مرنے والوں میں ابھی تک یہی ناکارہ جنوبی ویت نامی شامل ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ایک امریکی ماہر نے بڑے مطمئن لہجے میں اپنی دو بٹالین کا صفایا ہونے کی داستان ایک امریکی صحافی کو اس طرح سنائی:

"ہمارے پاس جنوبی ویت نامی فوجیوں کی دو بٹالین تھیں۔ جنگل میں مارچ کرتے ہوئے اچانک ویت کانگ سے ان کا سامنا ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد دونوں بٹالین کا مکمل صفایا ہو چکا تھا۔"

امریکی ماہرین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ویت نام میں جنگ کے ان دس سالوں میں انہوں نے کثیر تعداد میں امریکی فوج درآمد کی۔ لاکھوں کروڑوں ڈالر ویت نامی فوجیوں پر خرچ کئے لیکن اس کے باوجود شانہ بشانہ لڑنے والے یہ امریکی اور جنوبی ویت نامی فوجی خود کو اس طرح ہم آہنگ نہ کر سکے جس طرح کوریا میں انہوں نے کیا تھا۔ ایک امریکی فوجی ماہر بڑے کرب کے عالم میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے:

"ہم ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو گئے ہیں کہ امریکہ سے ہمارے فوجی آئیں اور یہ جنگ لڑیں اور مریں۔ ویت نام کی حکومت کے آدمی ہمارے کسی کام کے معلوم نہیں ہوتے۔ تاریخ کو اس سلسلے میں ہماری خارجہ پالیسی کی یہ ناقابلِ یقین ناکامی اب اپنی لوح پر منتقل کر لینی چاہیئے۔"

ویت نام کا ہر ساتواں آدمی فوج میں بھرتی کر لیا گیا ہے۔ فوج کی تعداد جو پانچ سال پہلے ۶ لاکھ ۱۵ ہزار تھی اب تقریباً دوگنی ہو کر ۱۱ لاکھ ۴۴ ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ پورے فوجی بجٹ کا ستر فیصد ان کی تنخواہوں پر صرف ہو جاتا ہے لیکن ان کی کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ جنوبی ویت نامی فوج کی پہلی بٹالین نے جو بہترین بٹالین سمجھی جاتی تھی شمالی ویت نام پر ۲۵ مسلسل حملے کئے لیکن ان حملوں کے نتیجے میں وہ شمالی ویت نام کے ایک سپاہی کو بھی ہلاک یا زخمی نہ کر سکی۔ ایک امریکی صحافی نے جو پچھیویں بٹالین کے ہمراہ تھا اس بٹالین کے بارے میں ایک ویت نامی جرنل کے یہ ریمارکس سنائے کہ یہ بٹالین شاید دنیا کی کسی فوج کی ناکارہ ترین بٹالین سے زیادہ ناکارہ ہے۔

سفر جاری ہے

انتخابات ختم ہو چکے

اب کام کا وقت آگیا ہے



ٹیلی ویژن کے جنرل مینیجر اسلم اظہر ٹی وی کے لئے مسٹر بھٹو کی تقریر ریکارڈ کر رہے ہیں



لیاری کی ایک خاتون مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو ہار پہنا رہی ہیں

محمود شام

۷۰، کلفٹن ہے۔

سر شاہنواز بھٹو
ذوالفقار علی بھٹو

پیتل کی یہ دو تختیاں اور کھلا دروازہ۔ کاریں، جیپیں اور ٹیکسیوں، رکشوں سے اترتے لوگ۔ لان میں شامیانہ نصب ہے، کرسیاں دھری ہیں۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، نوجوان، پیپلز پارٹی کے کارکن، لیڈر، ایم پی اے۔ ایم، این، اے۔ سبھی کچھ ہے۔ آج کل یہاں بہت رونق ہے اور اسی ۷۰، ۱۹ء کے شروع میں، درمیان میں یہاں ایک دو چہروں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا، البتہ باہر سڑک کے درمیان میں گھاس کے ٹکڑوں پر "قد دیان کرام" (سی آئی ڈی والے) ہوتے تھے۔ اب بے شمار لوگ ہار لے کر آتے ہیں۔ ان میں وہ حضرات بھی ہیں، جن کے اس



بیگم نصرت بھٹو اور ڈاکٹر شیمم زین الدین لیاری کی خواتین کے ہمراہ



خدا داد کالونی کے باشندوں کا ایک وفد جناب بھٹو کو اپنے مسائل بتا رہا ہے

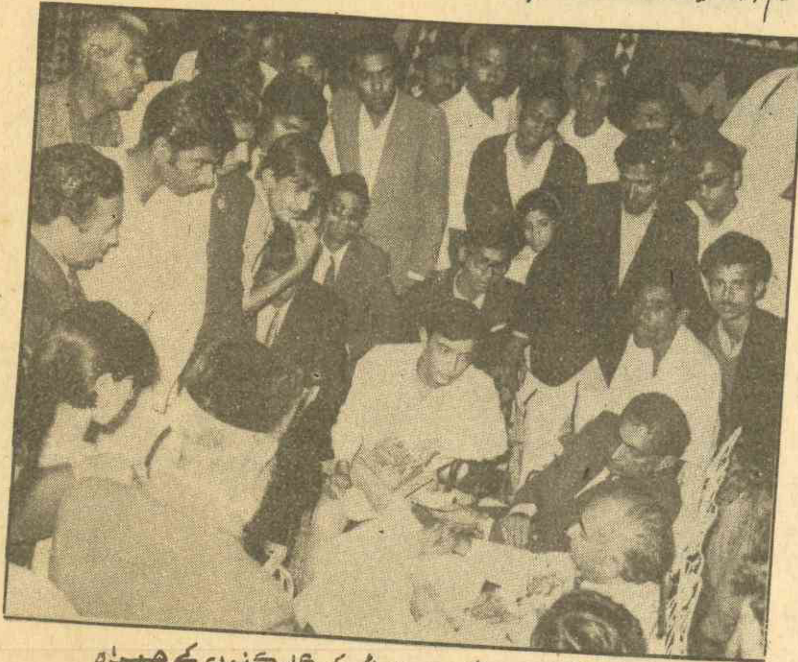
یہ لوگ جانے کہاں کہاں سے آئے ہیں ۔ دیہات سے ۔ شہر کے حصوں سے، یہ بے روزگار نوجوان ہیں، تعلیم جانے کیسے مکمل کی ۔ اب ملازمت نہیں مل رہی ہے، یہ داؤد ملز یونین کے مزدور ہیں، داؤد مل جہاں مزدوروں پر نہ جانے کیا کیا ظلم ڈھائے گئے ۔ جہاں کے مزدور لیڈر آج کل جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی جدوجہد کے مرحلے طے کر رہے ہیں ۔ ان کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی ۔ ایک سیٹھ کے خلاف ہزاروں مزدوروں کی نمائندگی کی ۔ جب انہیں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر فوجی عدالت میں لایا گیا تو عدالت کے در و دیوار چیخ اٹھے، آسمان کی آنکھ بھر آئی اور آس پاس کھڑے لوگ رو اٹھے کہ مزدور رہنماؤں کے ساتھ اس ملک میں وہ سلوک کیا جا رہا ہے جو قتل اور ڈاکے کے سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے یہ سلوک اس وقت کیا جا رہا ہے، جب عوام کی اکثریت ان نمائندوں پر اعتماد کا اظہار کر کے منتخب کر چکی ہے، جو مزدوروں، کسانوں کے حقوق کا علم اٹھا کر نکلے ہیں ۔ یہ لوگ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہننے والے عزیز الحسن کے ساتھی ہیں ۔ یہ لوگ احساس دلا رہے ہیں کہ ابھی منزل بہت دور ہے، راستہ بہت کٹھن ہے ۔

لیاری ۔ مظلوم عوام کی مظلومیت اور بے کسی کا مظہر بھی اور مظلوموں کی بیداری اور بے باکی کا ثبوت بھی وہ بلند آواز سے بول اٹھتی ہیں "جئے بھٹو" یہ ہارون خاندان کی اجارہ داری کو ختم کرنے والی ہستیاں ہیں ۔ لیاری کی عظیم مائیں، عظیم بہنیں ۔ لیاری، عوامی طاقت کا سرچشمہ ۔

بنگلہ کے مکین کے خلاف لمبے چوڑے بیانات چھپتے تھے۔ وہ بیگمات بھی ہیں ۔ جو انتخابات سے ایک روز پہلے تک اس پارٹی کے خلاف بیانات اگلتی رہیں ۔ لیکن یہ دروازہ سب کے لئے کھلا ہے ۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں بھی کھلا تھا، دسمبر ۱۹۷۰ء میں بھی کھلا ہے ۔ وقت وقت کی بات ہے ۔ جلوس، جلسوں کے بعد یہاں لوگ ذرا قریب سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں ۔ ہار ڈالنے والے تو ہیں ہی لیکن یہاں مسائل بھی ہیں ۔ انتخابات کے ہنگامے ختم ہو چکے، کام کا وقت آ گیا ہے ۔ غریب اور مظلوم عوام، مختلف طبقوں کے لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر آ رہے ہیں ۔ مسائل وہی ہیں، لیکن اب اس گھر سے امید ہو چلی ہے کہ مسائل حل ہو سکیں گے۔

یہ ایک بزرگ، جانے کہاں سے آئے ہیں ۔ ان کے چہرے پر پڑی جھریاں برسوں کی داستان سناتی ہیں، یہ پھٹے پرانے میلے کپڑوں میں لپٹا جسم ۔ صرف ایک شخص کا نہیں، اس ملک کے کروڑوں افراد کا ہے ۔ بڑے میاں کو حج کی آرزو ہے ۔ صاحب اگر خط لکھ دے تو یہ کام ہو سکتا ہے ۔ ان بڑے میاں نے یہیں کوٹھی کے ایک کونے میں ڈیرہ جما لیا ہے ۔ تین چار روز بعد وہ بڑے میاں ملتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا کام ہو گیا ہے ۔ اور وہ اب اپنے اس مقدس مشن پر چلے جائیں گے ۔

یہ لیاری کی خواتین ہیں ۔ وہ ہار ڈالنے آئی ہیں ۔



جناب ذوالفقار علی بھٹو اپنی پارٹی کے کارکنوں کے ہمراہ



جناب ذوالفقار علی بھٹو اپنی پارٹی کی خواتین کارکنوں کے ہمراہ



جناب بھٹو سے بائیں قاسم پٹیل ایم پی اے، حاجی عیسیٰ پٹیل اور پیپلز پارٹی کے دیگر ارکان کے ہمراہ

یہ صحافیوں کا وفد ہے۔ ان صحافیوں کا جنہیں "جنگ" "مشرق" پی پی آئی سے اس جرم میں نکال دیا گیا تھا۔ کہ وہ حق کی بات کرتے تھے، جمہوری امداد مانگتے تھے، جنگ کے اجارہ دار سرمایہ دار میر خلیل الرحمان، مشرق کی مزدور دشمن انتظامیہ پی پی آئی کے فکس اپ کے مستحق معظم علی کی سازش کے شکار ۱۳۱ صحافیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے انجمن صحافیانِ کراچی کے سیکرٹری مسٹر ظفر رضوی ایک میمورنڈم پیش کر رہے ہیں۔ جس میں اس سنگین واردات کی تفصیل ہے، جس کے تحت ۱۳۱ خاندانوں کو بے روزگار کر دیا گیا تھا۔ اور ان کا جرم وہی تھا۔ جو اور عوام دوست طاقتوں کا جرم تھا۔ بھٹو صاحب یقین دلا رہے ہیں۔ کہ مجھے اس میمورنڈم کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے میں نے ہمیشہ صحافیوں کے حقوق کی حمایت کی ہے۔ اور جن جن اداروں سے صحافیوں کو برطرف کیا گیا ہے، ہماری پارٹی نے ہمیشہ مطالبہ کیا ہے کہ انہیں ملازمتوں پر بحال کیا جائے۔ یہ لوگ "فکس اپ" کے لفظ سے بہت ہچکچاتے ہیں لیکن سینکڑوں صحافیوں کو ملازمتوں پر واپس نہیں لیتے۔ عوامی حکومت قائم ہوگی، تو پی پی آئی اور ٹرسٹ کے معاملات کی تحقیقات کروائی جائے۔

یہ کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کا وفد ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے معاملات سب کے سامنے ہیں، یہاں کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، عوام دشمن طاقتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ طلبہ کے داخلوں، طالب علم یونینوں کے انتخابات، اساتذہ کی تقرری اور برطرفی میں ہمیشہ وہ ایک خاص نظریے اور خاص سیاسی جماعت کی ہدایات کی پابندی کرتے ہیں کراچی یونیورسٹی کو انہوں نے "مٹی سائیگان" بنا رکھا ہے۔ ایوب کی حاشیہ برداری کے بعد وہ مولانا مودودی کی حاشیہ برداری کرتے رہے۔ اب پھر وہ اساتذہ کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ وہ اساتذہ جو عوام دوست طاقتوں کے ساتھ رہے ہیں۔ اب ان کے عتاب کا شکار ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ان کارخانہ داروں اور زمینداروں کی صف میں کھڑے ہیں جو اپنے کارکنوں اور مزارعوں کو اس جرم میں نکال رہے ہیں کہ انہوں نے پیپلز پارٹی کو، بھٹو کو "تلوار کو" عوامی منشور کو ووٹ دیا تھا۔ کراچی یونیورسٹی کے ستر اساتذہ کا بھی یہی مقصود ہے، کراچی یونیورسٹی کی دیواریں، برآمدے اور کمرے، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی سازشوں کی داستانیں سنا رہے ہیں، اساتذہ جو قوم کی تعمیر کرتے ہیں، ایک عجیب کرب کا شکار ہیں۔ کراچی یونیورسٹی سے موشے دایان کا سایہ کب چھٹے گا۔؟

یہ کارکن حضرات ہیں، پیپلز پارٹی کے کارکن، جو جانے کس کس علاقے سے آئے ہیں، انہوں نے اپنی پارٹی کے لئے دن رات کام کیا۔ اب انہیں ان کے اداروں کے مالکان ملازمتوں سے الگ کر رہے ہیں۔ کیوں کہ یہ بہت بڑا جرم تھا ایک عوامی سیاسی پارٹی کا ساتھ دینا۔ ان میں کسان بھی ہیں، کلرک بھی، مزدور بھی

یہاں معراج محمد خاں بھی موجود ہیں، طارق عزیز بھی، میر رسول بخش تالپور بھی، میر علی احمد تالپور بھی، ایم این اے حضرات، عبدالحفیظ پیرزادہ، غلام مصطفیٰ جتوئی، حاکم علی

زرداری، ایم۔ پی۔ اے حضرات، قاسم پٹیل، عبداللہ بلوچ، سید امداد حسین شاہ، سید سعید حسن، احمد علی سومرو، ولی محمد جاموٹ اور حنیف سولجر بھاگ دوڑ میں آگے آگے ہیں لوگوں کو خط لکھوا لکھوا کر دے رہے ہیں۔ عبداللہ بلوچ اپنے علاقوں کے لوگوں کے مسائل سن کر ان کے لئے خط لکھوا رہے ہیں، روزانہ سینکڑوں خط، بے شمار محکموں کے نام لکھے جا رہے ہیں۔

ان خطوط کا کچھ بنے نہ بنے۔ لیکن بھٹو صاحب کو اس طرح ہزاروں لوگوں کو ملنے سے مسائل کا بہت قریب سے جائزہ لینے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ خداداد کالونی کا وفد ہے۔ جنہیں بے دخل کیا جا رہا ہے۔ متوسط طبقے اور غریب طبقے کے افراد نہ جانے کیسے اپنے رہنے کے لئے مکان بنا سکے اور اب انہیں بے دخل کیا جا رہا ہے۔ وہ اب کیا کریں۔

یہ کشمیری حضرات کا وفد ہے۔ میر عبدالمنان، مقبول بٹ، میر عبدالقیوم اور دوسرے حضرات۔ کشمیر کے لئے، بھٹو صاحب کا مؤقف شروع سے ہی بہت سخت رہا ہے۔ اب گلگت میں گرفتار ہونے والوں کے لئے ان حضرات کو قانونی حمایت درکار ہے۔ وہ ایک ڈیفنس کمیٹی بنا رہے ہیں؛ اس میں پی پی پی کی طرف سے دو وکیل چاہتے ہیں۔ خورشید حسن میر، اور دوسرے میاں محمود علی قصوری کے لئے پارٹی کے سربراہ کی طرف سے اجازت مل گئی ہے۔

ہزاروں لوگوں، مزدوروں، کسانوں، طالب علموں، استادوں کو قریب سے جاننے کے بعد بھٹو صاحب کو بھی مسائل کا اور زیادہ علم ہوا ہے۔ اسی لئے لاڑکانے جاتے جاتے انہوں نے اخبار والوں سے جو بات کی، اس میں عوامی مسائل پر بھی شدید کرب کا اظہار کیا، آسمان سے باتیں کرتی قیمتوں کا مظلوم عوام پر بوجھ۔ مزدوروں، کسانوں کے ساتھ۔ کارخانہ داروں اور زمینداروں کا ناروا سلوک۔ انہوں نے حکومت پر اپنا فرض پورا کرنے کا زور دیا۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر عوام کو ان پریشانیوں سے نجات نہ دلائی گئی تو میں عوامی سیلاب کا بند کھولنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ عوامی سیلاب۔ جسے کوئی نہیں روک سکتا۔ ●●

کراچی کے امیر جماعت مودودی پروموشن کے مستحق ہیں

ثریا حیا

جماعتِ اسلامی نے کراچی میں دو نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ اس بات پر یقیناً کراچی کے امیرِ جماعت اسلامی کو "پروموشن" ملا ہوگا اور جماعت کے سی۔ ایس۔ پی افسروں کی سنیارٹی لسٹ (SENIORITY LIST) میں ان کا نام کچھ اور اوپر چلا گیا ہوگا جماعت نے ان نشستوں کو جیتنے کے لئے جو مہارت دکھائی ہے اس پر موصوف اس پروموشن کے صحیح مستحق بھی ہیں۔ خود میں اس بات کی عینی شاہد ہوں۔ میں حلقہ نمبر ۵ کے ایک پولنگ اسٹیشن پر پولنگ ایجنٹ تھی اور جماعت کی کارروائیوں اور کارگزاریوں پر انگشت بدنداں تھی ــــ اس ضمن میں کچھ آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔

میں حلقہ نمبر ۵ کے پولنگ اسٹیشن نمبر ۸۴ میں تھی۔ اور پولنگ کے دوران میں جماعت کی کارکنوں نے جس طرح بغیر پڑھی لکھی عورتوں کے ساتھ ترازو پر نشان لگوانے کے لئے ڈرامے رچائے وہ بیان سے باہر ہیں۔ گنتی کے دوران میں ۱۹ ووٹ اس قسم کے تھے کہ ان پر دو امیدواروں یعنی ایک ترازو والے اور ایک اور دوسرے امیدوار کے نشان پر مہر تھی لیکن یہ ووٹ جماعتِ اسلامی کے حق میں مانے گئے۔ اس کے علاوہ جماعتِ اسلامی نے اس حلقہ میں بھی کھلے عام پی۔ آئی۔ اے کی گاڑیاں ووٹروں کو بھر کر لانے کے لئے استعمال کیں۔ اس ضمن میں پولیس کے رضاکاروں نے بھی اہم خدمات انجام دیں اور جماعت کی اس دھاندلی کو نظر انداز کرتے رہے۔

بوگس ووٹنگ کا ذکر بھی اس ضمن میں اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ایک اندازے کے مطابق جماعت نے ۹ کروڑ روپیہ ان انتخابات کی نذر کیا ہے اور یہ روپیہ ظاہر ہے کہ انہیں ناجائز طریقوں کی ترویج پر بھی صرف ہوا۔

جہاں میں پولنگ ایجنٹ تھی وہاں بھی پولنگ کے دوران میں کئی خواتین کی کوشش ناکام بنائی گئی اور ان کی پرچیوں اور کارڈوں سے اس بات کا ثبوت بھی ملا کہ وہ جماعت کے کیمپوں سے پرچیاں بنوا کر لائی ہیں۔ اس ضمن میں ایک دو دلچسپ واقعات بھی سناتی چلوں۔ دوپہر تین بجے کے قریب ایک عورت اپنی پرچی لے کر ووٹ ڈالنے آئیں۔ پولنگ آفیسر نے نام پوچھا تو جواب ملا: "محمد بشیر۔"

پولنگ آفیسر نے کہا: "میں نے آپ کا نام پوچھا ہے آپ کے شوہر کا نہیں۔"

ووٹر خاتون پہلے تو خاموش رہیں۔ پھر کہنے لگیں۔

"پرچی میں جو لکھا ہے وہی ہے۔"

پولنگ آفیسر نے گھر کا پتہ پوچھا تو وہ بھی ندارد۔ آخر جب ذرا ڈانٹ ڈپٹ کی تو بولیں: "میرا نام سائرہ ہے۔" ــــ حالانکہ پولنگ میں ہاجرہ بیگم درج تھا۔ پولنگ آفیسر نے جب پولیس کی دھمکی دی تو جلدی سے بولیں "اب ہم کو کیا پتہ ہم کو تو وہ ترازو والوں نے لکھ کے دیا تھا۔ کارکنوں نے ووٹر خاتون کو مکان کا پتہ اور نام بھی رٹوا دیا ہوتا تو "عزتِ سادات" تو نہ جاتی۔

ایک اور واقعہ سنیئے۔ پولنگ ختم ہونے سے پانچ منٹ پہلے دو لڑکیاں جو عمر اور حلیہ سے کسی طرح ۱۶ یا ۱۷ سال سے زیادہ کی نہیں تھیں ووٹ ڈالنے آئیں۔ ان میں سے ایک لڑکی میری شناسا تھی۔ محترمہ کی سکونت ناظم آباد میں تھی۔ ان کی پرچی کی رو سے معلوم ہوا کہ شادی شدہ ہیں حالانکہ وہ ابھی انٹر کی طالبہ ہیں۔ میں نے اعتراض کیا تو کہنے لگیں:

"ہم پہلے ناظم آباد میں رہتے تھے۔ اب یہاں آگئے ہیں۔"

پولنگ آفیسر نے مکان نمبر پوچھا تو کہنے لگیں:

"ابھی ہمیں یہاں آئے ہوتے ایک مہینہ ہوا ہے مکان کا نمبر نہیں معلوم۔" ان کے جھوٹ کا پول یہیں کھل گیا۔ میں نے کہا: "محترمہ شاید آپ کو یاد ہو کہ ووٹروں کی فہرست جولائی میں تیار ہوئی تھی، نومبر میں نہیں۔" ان کے پاس بھی جماعت کے کیمپ کی تیار کردہ پرچی تھی۔

یہ سب کچھ جو میں نے بیان کیا ہے آنکھوں دیکھا ہے۔ دوسری جگہوں پر کیا ہوا اس کا اندازہ تو وہاں کے افراد ہی کر سکتے ہیں۔

کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن میں جماعت اسلامی کی یونین کا انتظامیہ پر کتنا اثر ہے۔ اس کے ثبوت میں یونین کے ہی ایک رکن کا خط شائع کیا جا رہا ہے، جنہیں ان کے تین ساتھیوں سمیت یونین سے اس لیے خارج کر دیا گیا تھا کہ انہوں نے جناب بھٹو کی کامیابی پر انہیں مبارکباد دی تھی اور اس اخراج کا سرکلر انتظامیہ کے ایک اعلیٰ افسر نے باقاعدہ سرکاری طور پر جاری کیا تھا۔ ہم اس سے قبل بھی کے ای ایس سی کی جانبداری کے بارے میں لکھ چکے ہیں۔ اس سلسلے میں اس کے ایک افسرِ اعلیٰ نے ہمیں آکر مطمئن کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ہم کے ای ایس سی کی جانبداری کا اب یہ دستاویزی ثبوت شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس کی انتظامیہ اب توضیحات پیش کرنے کی بجائے کے ای ایس سی کو جانبداری میں ملوث کرنے والے ارکان کا احتساب کریگی (ادارہ)

کے ای ایس سی کی انتظامیہ یونین کے ادارہ رابطہ عامہ کے فرائض انجام دیتی ہے

حفیظ الرحمٰن

۱۵ دسمبر ۰ء کو میں اپنی آفس سیٹ پر بیٹھا دفتری کام میں مصروف تھا کہ اتنے میں ناظم آباد ڈویژن کے ایک مزدور عزیز دندناتے ہوئے میری سیٹ کی طرف آئے اور چھوٹتے ہی مجھے گالیاں دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے آیا اور کہا "اگر تم نے عدالت شاہ (صدر) کے خلاف آئندہ کوئی آواز اٹھائی تو اس کا خمیازہ بھگتو گے"۔ میں نے عزیز کو سمجھانے کے لئے اسے بتایا کہ میرا عدالت شاہ سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے بلکہ اصولی اختلاف ہے لیکن اس بے چارے کو میرے خلاف اس قدر اُبھارا گیا تھا کہ میں شاید اپنی بات بھی مکمل نہیں کر پایا تھا کہ اس نے عدالت شاہ کے آخری احکامات پر بھی عمل درآمد شروع کر دیا اور اس طرح میرا گریبان تھا اور اس کا ہاتھ۔ بہرحال وہ اپنی ڈیوٹی کو بحسن و خوبی انجام دینے کر چلا گیا۔ اس دوران دفتر کے لوگ جو میرے آس پاس جمع ہو چکے تھے، مجھ سے تسلی آمیز سوالات کر رہے تھے اور مجھے خوب محسوس ہو رہا تھا کہ ان سفید پوش امن پسندوں کی نیک خواہشات تو میرے ساتھ ہیں اور اس غنڈہ گردی پر ان کے دلوں میں نفرتوں کے لاوے ہیں لیکن یہ کچھ تو "اپنی عزت اپنے ہاتھ" کے مقولوں کے اسیر شریف لوگ اور کچھ عدالت شاہ کے انتظامیہ کے ساتھ مرعوب کر دینے والے تعلقات کے نیچے دبے ہونے کی وجہ سے محض افسوس کے اظہار کے سوا کچھ اور کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ مگر ان کے یہ جملے، ان کے یہ الفاظ اور ان کے یہ معذرت خواہانہ لہجے ان کے اس ترقی پذیر شعور کو ظاہر کر رہے تھے کہ جیسے یہ جو کچھ ہوا ہے یہ لوگ بھی اس کا ایک حصہ ہیں لیکن میرا یہ یقین ہے کہ جوں جوں عوام کے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد بڑھتی ہے توں توں عوام ناقابلِ تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر کوئی عزیز کسی حفیظ کے گریبان پر ہاتھ نہیں ڈالتا، بلکہ ان سب کے ہاتھ ایک ہی سمت میں اٹھتے ہیں، لوٹنے والوں کے گریبانوں کی طرف۔ عوام کے خلاف سازشیں کرنے والوں کے اماموں کی طرف!

K. E. S. C. Ltd.
INTERDEPARTMENTAL MEMO

From: CHIEF INDUSTRIAL & PUBLIC RELATION OFFICER. To: ALL HEADS OF DEPARTMENTS.

Ref. No: L-33/7? / 1.9.84. Date: 15th December, 197?.

As per intimation received from the General Secretary, K.E.S.C. Ltd. Labour Union, it is notified for the information of all concerned that M/S. Ashfaque Ali Khan of Meter Testing Department, Hafeez-ur-Rehman of Garden Zone and Sarfraz of ?? Division who were previously acting as representatives of the Union have been debarred to act as a representative of the K.E.S.C. Ltd. Labour Union.

L.S.F. LODI
Lt.Col. (Retd.)
CHIEF INDUSTRIAL & PUBLIC
RELATION OFFICER.

بھٹو کو مبارک باد دینے والے

چار ارکان کو یونین سے خارج کر دیا گیا

KESC LABOUR UNION'S DEMAND

The Executive body of the Karachi Electric Supply Corporation Labour Union has called on the management to sanction allowances and leave granted by the Government to the Corporation's staff.

It also congratulated People's Party Chairman, Z. A. Bhutto, on the success of his party in the recent National Assembly elections.—APP.

مارچ ۱۹۶۷ء میں کے ای ایس سی لیبر یونین وجود میں آئی۔ عدالت شاہ اور حیات شاہ بالترتیب صدر اور سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اور اس طرح ورکرز میں ایک اطمینان پیدا ہوا کہ اب ان کے مفادات کی نگرانی کرنے والا ایک ادارہ وجود میں آگیا ہے لیکن بہت جلد ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ لیبر یونین ورکرز کے ساتھ جڑ کر ان کے مفادات کی نگرانی نہیں کرتی بلکہ انتظامیہ کے ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر، اس کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے کبھی کبھار الاؤنسوں اور سہولتوں میں اضافہ کراتی رہتی ہے۔ یہ بات ظاہر ہوئی کہ جدوجہد کی بجائے ورکروں کی طاقت کی بجائے انتظامیہ کے ساتھ تعلقات پر انحصار کر کے لیبر یونین ایک طرف ورکروں کا اپنی قوت پر اعتماد، ان کی عزتِ نفس اور خودداری کا خاتمہ کر رہی ہے اور دوسری طرف پیداواری امن قائم کرنے کے صلے میں انتظامیہ سے معاوضہ وصول کر رہی ہے۔ اسی دوران میں ہمارے ملک میں دو واضح سیاسی رجحان ابھرنا شروع ہوئے تو کے ای ایس سی لیبر یونین بھی اس میدانِ کارزار میں کود پڑی اور یہاں بھی اس نے اپنی گٹھ جوڑ کی پرانی روش کو قائم رکھتے ہوئے ان عوامی رجحانات کو رد کر دیا کہ جو آزادی، اقتصادی عدل و انصاف اور انسانیت کی بحالی پر مبنی تھے۔

عدالت شاہ کی سرکردگی میں لیبر یونین کے تمام وسائل اور تمام قوتیں اس ملک کی تاریک غیر منصفانہ اور عوام دشمن قوتوں کی حمایت میں صرف ہونا شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ عدالت شاہ نے لیبر یونین کی طرف سے جماعتِ اسلامی کی کال پر "یومِ شوکتِ اسلام" بھی منا ڈالا۔ اس دوران ۱۹۶۸ء کے آغاز میں مجھے گارڈن زون سے ورکرز نے مجلسِ عاملہ میں اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کیا۔ میں اس عرصے میں لیبر یونین کی تمام سرگرمیوں کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں یونین کے ناخداؤں پر مندرجہ ذیل باتیں واضح کرنے کی کوشش کی کہ:

۱: ہمیں ورکرز کے مطالبات منوانے کے لئے انتظامیہ سے گٹھ جوڑ کرنے کے بجائے ورکرز پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

۲: یونین کے عہدیداروں کو انتظامیہ کا دُم چھلّہ بن کے ذیلی بیورو کریٹ نہیں بننا چاہیئے۔

۳: یونین کو گھٹیا سیاسی مقاصد کا آلۂ کار نہیں بنانا چاہئیے۔ میری ان باتوں کا تمام کارکنوں نے بالعموم اور یونین کے چند اراکین نے بالخصوص خیر مقدم کیا۔ لیکن یونین کے اعلیٰ عہدیداروں نے ان باتوں کو لفظاً اور عملاً مسترد کر دیا اور اپنی پرانی روش کو قائم رکھا۔

جیسے جیسے پاکستانی عوام کی آزادی اور اقتصادی انصاف کی جدوجہد تیز ہوتی گئی ویسے ویسے کے ای ایس سی لیبر یونین عوام کو دبانے والی طاقتوں بالخصوص جماعت اسلامی کا آلۂ کار بنتی چلی گئی۔ کے ای ایس سی کے وطن ورکرز اس صورت حال سے انتہائی بددل اور ناخوش تھے لیکن وہ انتظامیہ اور اس ملک کی سیاہ طاقتوں کے حمایت کردہ حیات شاہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وہ وقت تھا کہ جب میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنے عمومی ملکی مفادات اور عوامی امنگوں کا ساتھ دیتے ہوئے لیبر یونین کی ہائی کمان کے خلاف احتجاج کیا لیکن ہماری اس آواز کو بری طرح دبا دیا گیا۔ ان لوگوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لئے نہ صرف انتظامیہ ہی کا ساتھ دیا بلکہ اس ملک کی ایک ایسی جماعت کا بھی ساتھ دیا۔ کہ جو ۲۲ خاندانوں کی حمایت ہی نہیں کرتی بلکہ ان کے حق میں مذہبی فتوے بھی جاری کراتی ہے۔ اپنے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ان لوگوں نے کے ای ایس سی لیبر یونین کا تقریباً ایک لاکھ روپے کا چندہ استعمال کیا اور آج تک اس کا کوئی حساب کتاب پیش نہیں کیا۔ واضح رہے کہ یونین کا چندہ ایک ایسا ریزرو فنڈ ہوتا ہے کہ جو ہڑتال پالیسی اور مصیبت میں مزدوروں کو سرمایہ داروں سے تحفظ کا احساس دلاتا ہے جس سے اس ٹولے نے کے ای ایس سی کے مزدوروں کو محروم کر دیا ہے۔ اور اس ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کے اشارے پر حیات شاہ (سیکرٹری) کو ڈرگ کالونی صوبائی حلقہ نمبر ۱۵ سے بطور ایک اسلام پسند امیدوار کھڑا کرنے کے لئے کے ای ایس سی کے مزدوروں سے جبری چندہ لیا۔ اور حالیہ انتخابی مہم میں ان لوگوں نے کے۔ ای۔ ایس۔ سی کی گاڑیوں کو استعمال کیا جس کے خلاف پہلے بھی اخبارات میں احتجاج ہو چکا ہے۔

۷ دسمبر کے روز آخر عوام نے واضح طور پر آزادی، اقتصادی انصاف کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے پاکستان پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کا انتخاب کیا۔ عوام نے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مذہب کے نام پر لوٹنے والوں کو رد کر دیا۔ پیپلز پارٹی کی اس شاندار فتح نے کے ای۔ ایس۔ سی۔ کے مزدوروں کے حوصلے اور بلند کر دیئے اور ہم لیبر یونین کی مجلس عاملہ کے چار حریت پسند ممبروں نے اپنے ورکروں کے جذبات کا ساتھ دیتے ہوئے پیپلز پارٹی کی شاندار فتح کے موقع پر اس کے چیئرمین جناب زیڈ۔ اے بھٹو کو مبارکباد دیتے ہوئے بیان دیا یہ بیان جو اخبارات میں چھپا اس میں ہم نے کے ای۔ ایس۔ سی کی انتظامیہ سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ گورنمنٹ کی طرف سے منظور شدہ تفریحی الاؤنس اور چھٹیاں فوراً منظور کر لے۔ اس بیان کا اخبارات میں چھپنا تھا کہ عدالت شاہ اور اس کے حمائتی حرکت میں آ گئے اور ان میں کے ای ایس سی لیبر یونین کے جائنٹ سیکرٹری بھی شامل ہیں جو کہ جماعت اسلامی کے ممبر ہیں۔ ۱۶ دسمبر کو عدالت شاہ میرے دفتر آیا اور علیحدگی میں مجھے بھی اس ذلیل کاروبار میں شرکت کی دعوت دی کہ جس کے وہ لوگ خود مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ حفیظ صاحب اگر آپ کو کوئی مالی پریشانی ہو تو ہم ہر طرح سے

باقی صفحہ ۴۲ پر

اساتذہ جامعہ میں آمریت کے خاتمہ کی جدوجہد کر رہے ہیں

نمائندہ الفتح

کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ اپنی طویل جدوجہد کے بعد اب ۱۵ جنوری ۱۹۷۱ء سے ہڑتال جیسا انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ اس وقت جبکہ پورے ملک میں معاشی بے اطمینانی کا راج ہے اور پورا ملک چند گماشتہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں استحصال زدہ ہے، معاشی مقاصد کے لئے متوسط طبقے کے ان اساتذہ کی یہ جدوجہد موجودہ معاشی نظام کے کھوکھلے پن کی ایک بڑی علامت بن گئی ہے۔

اس جدوجہد کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے یہ اساتذہ اپنے پیشے کے وقار کو برقرار رکھنے اور بڑے "تعلیمی وڈیروں" کی دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے خاتمہ کے لئے یونیورسٹی کے پورے ڈھانچہ کو جمہوری بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ جامعہ کراچی پر اب تک سیاسی طور پر جماعتِ اسلامی کا تسلط رہا ہے اور اسے سامراج کے نیم نوآبادیاتی ممالک کی طرح "امریکہ پسند" نوکر شاہی کی تیاری کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس جامعہ کے بیشتر اساتذہ امریکی یونیورسٹیوں میں تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ان امریکی یونیورسٹیوں میں ایشیا و افریقہ سے آنے والوں کی جس طرح تربیت کی جاتی ہے یہ اب ڈھکی چھپی حقیقت نہیں رہی ہے۔ انڈونیشیا کے بارے میں جو انکشافات ہوئے انہوں نے فورڈ، راک فیلر اور ایسی ہی دوسری امریکی فاؤنڈیشن اور امریکی یونیورسٹیوں کے کردار کو واضح کر دیا ہے کہ کس طرح انہیں سی آئی اے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ امریکی ہارورڈ یونیورسٹی سی آئی اے کا ایک معروف مرکز ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں سے اسکالرشپ پر بھیجے جانے والوں کی ایک بڑی اکثریت وہاں سے تربیت حاصل کرکے آئی ہے، یا کر رہی ہے۔

اس تمام صورتِ حال کو موثر کنٹرول میں رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جامعہ کے نظام میں جمہوری عنصر غالب نہ آنے پائے۔ اس کے لئے بڑی طویل سازشیں ہوئی ہیں۔ جس زمانے میں اے۔ بی۔ اے حلیم یہاں وائس چانسلر تھے، اس وقت ملک میں نام نہاد جمہوریت تھی۔ کچھ اس کا اثر تھا کہ یونیورسٹی کے ڈھانچہ پر آمرانہ کنٹرول ان طاقتوں کو حاصل نہ رہا لیکن اس زمانے میں بھی "ورلڈ یونیورسٹی سروس" قائم رہی اور اس کے ذریعے کاروبار جاری رہا۔ ایوب خاں کی آمریت آئی تو یونیورسٹی سے چھوٹی موٹی اور نام نہاد قسم کی جمہوریت بھی ختم ہوگئی۔ اشتیاق حسین قریشی کے مربی ایوب خاں نے یونیورسٹی آرڈیننس لاد کر قریشی صاحب کے ایک پرانے مطالبہ کو پورا کیا اور اس طرح انہیں اپنے جال پھیلانے اور اپنا اصل مقام حاصل کرنے کے لئے تمام آسانیاں میسر آگئیں۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے طلبہ سے لے کر اساتذہ تک کی صفوں میں ترقی پسندی یا آزاد خیالی کا نام تک لینا کفر قرار دے دیا گیا۔

طلباء و اساتذہ اس یونیورسٹی آرڈیننس کو ختم کرانے کے لئے ایک عرصے سے جدوجہد کر رہے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں۔ اساتذہ کی اس جدوجہد کا بنیادی محور بھی یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ ہے۔ اشتیاق حسین قریشی جن مفادات کی نگہبانی کر رہے ہیں اس کے لئے یہ آرڈیننس ایک بڑا ہتھیار ہے۔ اسی لئے وہ اور ان کے ہمنوا اس کی منسوخی کی راہ میں سب سے بڑی دیوار رہے ہیں۔ شام کے ایک انگریزی روزنامے نے اپنی حالیہ اشاعت میں اپنے نامہ نگار خصوصی کا ایک مضمون اس موضوع پر شائع کیا ہے صاحبِ مضمون (جن کا جناب اشتیاق قریشی سے گہرا تعلق ہے)، نے دعویٰ کیا ہے کہ یونیورسٹی آرڈیننس ۶۲ء کسی ایک فرد کے خلاف بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ گوہر افشانی بھی کی ہے کہ اساتذہ نے اس آرڈیننس کا مطالعہ تک نہیں کیا۔ صاحبِ مضمون اس کی اشاعت کا اہتمام دسمبر ۶۹ء سے پہلے کرتے تو دربار و سرکار سے انہیں بھی کوئی تمغۂ نصرت وغیرہ مل جاتا لیکن اس وقت ان کا یہ دعویٰ کہ یہ آرڈیننس کسی طالب علم یا استاد کے خلاف استعمال نہیں ہوا عام فہم سے بالاتر محسوس ہوتا ہے

اس سلسلے میں واضح بات یہ ہے کہ وہ فیصلہ جو یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے یا شیخ الجامعہ نے کیا اور مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کے ساتھ زیادتیاں ہوئیں اس کی ذمہ داری براہِ راست یونیورسٹی آرڈیننس پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اگر یونیورسٹی آرڈیننس نہ ہوتا تو شیخ الجامعہ کو اس قدر وسیع اختیارات حاصل نہ ہوتے اور نہ خود ان کی سفارش پر سنڈیکیٹ نامزد کی جاتی۔

وائس چانسلر یونیورسٹی آرڈی ننس کی تخلیق ہیں

یہی حال اساتذہ کے تقرر کے لئے انتخابی کمیٹیوں کا ہے۔ ان کے ارکین بھی شیخ الجامعہ کی سفارش پر نامزد ہوتے ہیں۔ کسی جگہ بھی انتخاب اور رائے دہی کا حق استعمال نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں جامعہ کراچی کے چند واقعات قابلِ ذکر ہیں۔

۱: ۱۹۶۳ء میں شعبۂ فلسفہ میں جناب منظور احمد کا تقرر ہوا جبکہ ان سے بہتر قابلیت کے امیدوار موجود تھے۔

۲: ۱۹۶۸ء میں ایم۔ اے کے ایک پرچے کے سلسلے میں انہی منظور صاحب پر امتحانات کی رازداری سنگین خلاف ورزی کا الزام ماڈریشن کمیٹی کے ممبروں نے عائد کیا لیکن اس کے باوجود منظور صاحب ترقی پا کر صدرِ شعبہ ہو گئے اور الزام لگانے والوں میں ایک صاحب کو اپنی ملازمت اور دوسرے کو شعبہ کی صدارت سے ہاتھ دھونے پڑے۔

۳: ۶۴ء میں جناب فصیح الدین کو جو محض ریاضی میں سیکنڈ ڈویژن ایم۔ اے ہیں، شماریات کا صدر بنایا گیا جبکہ شماریات کے ڈگری یافتہ افراد کی اس ملک میں کمی نہیں۔ پھر جب جون ۶۹ء میں شماریات کے نئے پروفیسر نے انہیں شماریات کے قابل نہ سمجھ کر شعبہ میں کوئی کام نہیں دیا تو پورے چھ مہینے فصیح صاحب کو گھر بٹھا کر تنخواہ دی گئی۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ فصیح صاحب سرکاری ملازم ہیں اور جامعہ میں ڈیپوٹیشن پر ہیں۔

۴: محترمہ شائستہ زیدی کو انکی آزمائشی مدت پوری ہونے کے ایک دن بعد یہ اطلاع دی گئی کہ ان کو مستقل نہیں کیا جائے گا۔ جبکہ کراچی یونیورسٹی ایکٹ ۵۱ء میں یہ صاف طور پر درج ہے کہ اگر جامعہ کسی استاد کو مستقل نہیں کرنا چاہتی تو آزمائشی مدت کے اختتام سے کم از کم ایک ماہ قبل تحریری طور پر اس امر کی استادِ مذکور کو اطلاع دینی ہو گی۔ اب اگر یہ یونیورسٹی آرڈیننس ۶۳ء نافذ نہ ہوتا اور ۵۱ء کا ہی قانون رائج ہوتا تو محترمہ شائستہ زیدی کو برطرف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

۵: یونیورسٹی آرڈیننس نے سنڈیکیٹ کے ارکان کو وائس چانسلر کا اس قدر تابع بنا دیا ہے کہ سنڈیکیٹ کا ہر فیصلہ دراصل شیخ الجامعہ کے کئے ہوئے فیصلہ کی توثیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب فروری ۶۸ء میں شیخ الجامعہ نے محترمہ شائستہ زیدی کو برطرف کرنا چاہا تو سنڈیکیٹ نے بھی یہی فیصلہ صادر کر دیا اور جب مارچ ۶۹ء میں شیخ صاحب ان کو دوبارہ ملازمت دینے پر مجبور ہوئے تو سنڈیکیٹ نے ان کی ملازمت بحال کر دی۔ ایک طویل فہرست اس قسم کے دیگر واقعات کی بھی تیار ہو سکتی ہے۔

شیخ الجامعہ اور یہ آرڈیننس ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم سے ہو گئے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ آرڈیننس ان کی تخلیق ہے تو یہ بھی غلط نہیں کہ وہ خود آرڈیننس کی تخلیق ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کا دس سالہ دورِ اقتدار ظلم اور بے انصافیوں کے متعدد واقعات سے عبارت ہے۔ طالب علموں اور استادوں پر طرح

جاسوسی کرنے

والے جامعہ میں

ترقی پانے کے

اصل حق دار ہیں

طرح سے زیادتیاں کی گئیں۔ پورے زمانے متعدد اسلامی جمعیتِ طلبہ کے اراکین استادوں کی جگہ مقرر کئے گئے جبکہ این ایس ایف کے ذہین سے ذہین طالب علم پر یہ دروازے بند تھے۔ اگر کوئی طالب علم کسی وجہ سے مددگار لیکچرار بنا بھی دیا گیا تو اس کی 'سرخی' کی اطلاع ملتے ہی کسی نہ کسی بہانے اس کو برطرف کر دیا گیا۔ شعبۂ طبیعیات کے جناب منیر اور احمد علی اسی طرح ملازمت سے برطرف کئے گئے اور آج چار سال بعد ان ۵۵ مددگار لیکچراروں کی برطرفی کی تلخی اب بھی جامعہ کی فضا کو مسموم کئے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی جمعیت طلبا، اور دیگر اسلام پسند جماعتوں کے پسندیدہ طالب علموں کو علمی قابلیت کی کمی کے باوجود ملازمتیں دی گئیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو پہلے تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئے اور بعد میں بمشکل تمام سیکنڈ ڈویژن حاصل کر کے اور بعض ایسے کہ جو اپنا ایم۔ اے کا امتحان بھی ایک دو نہیں بلکہ کئی قسطوں میں پاس کر سکے۔ یہ حضرات جامعہ میں ملازم ہیں۔ مستقل ہو گئے ہیں اس لئے کہ پڑھانے سے زیادہ جاسوسی میں ماہر ہیں

یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ شیخ الجامعہ کے ایک منظورِ نظر صدرِ شعبہ کے ریٹائر ہونے میں جب دو ماہ رہ گئے تھے تو اچانک انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کی عمر اس عمر سے تین سال کم ہے جو آج تک وہ لکھتے اور سمجھتے آتے ہیں۔ غرض بڑی آسانی سے سنڈیکیٹ نے ان کی عمر تین سال کم کر دی اور اس طرح خود بخود مدتِ ملازمت میں توسیع ہو گئی۔ اس کے علاوہ گزشتہ دنوں یہ راز بھی کھلا کہ زیادہ تر مددگار لیکچررز کو عارضی بنیاد پر رکھا جاتا ہے جن کی مدتِ ملازمت میں ہر چھ ماہ بعد اضافہ کیا جاتا ہے تاکہ ان کے سر پر ہر وقت برطرفی کی تلوار لٹکی رہے اور وہ کسی وقت سر نہ اٹھا سکیں۔ اکثر لکچرار پانچ پانچ سال تک اسی طرح کام کر رہے ہیں اور ان کی ملازمت کو مستقل نہیں کیا جاتا تاکہ وہ ملازمت کے حقوق کا مطالبہ نہ کر سکیں اور جس وقت چاہیں انہیں نکال باہر کیا جائے۔ سنہ ۶۷ء میں اسی وجہ سے بیک وقت ۵۵ لیکچررز کا اخراج ممکن ہوا جو محض اس قصور پر برطرف کر دیئے گئے کہ انہوں نے یونیورسٹی کی انتظامیہ پر تنقید کرنے کی جسارت کی تھی۔

جامعہ کے سلسلے میں اشتیاق حسین قریشی اور ان کے ارد گرد رہنے والوں کے کارنامے اب خاصے معروف ہو چکے ہیں لیکن ۱۵ جنوری سے ہونے والی جامعہ کے اساتذہ کی ہڑتال کے سلسلے میں وہ کیا کارنامے انجام دینے والے ہیں، ان کی نگاہ منتظر ہے۔

اساتذہ یونیورسٹی آرڈیننس کی منسوخی کے علاوہ جن مطالبات کو منوانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں ان میں ان کے نئے پے اسکیل کی منسوخی اور ان پر نظرِ ثانی جامعہ کے ڈھانچے کی جمہوری طور پر تشکیلِ نو کے مطالبات شامل ہیں۔

کراچی پریس کلب میں صحافیوں کا جلسہ

برطرف شدہ صحافیوں کو ملازمتوں پر بحال کیا جائے

وہاب صدیقی

دوستو، ساتھیو! ایک مدت کے بعد ہم یہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔

اس عرصے میں وطن عزیز کے سیاسی افق پہ بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ ملک میں پہلی بار عام انتخابات ہوئے۔ جس میں بڑے بڑے شاطر سیاست دان، سرمایہ دار اور جاگیر دار ناک آؤٹ ہو گئے۔ سامراج نواز جماعتوں کو، جن کی خبریں مقبوضہ اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتی تھیں، عوام نے رد کر دیا۔ اور وہ جماعتیں کامیاب ہوئیں۔ جو عوامی مسائل کا واضح حل پیش کرتی تھیں۔ یہ تمام سیاسی تبدیلیاں عوامی شعور کی بالیدگی کی مظہر ہیں اس مرحلے پہ صحافیوں کا قومی فرض ہے کہ وہ آزادی صحافت، جو جمہوری نظام میں کلیدی حیثیت کی حامل ہوتی ہے، کے حصول کی جدوجہد تیز کر دیں۔ کیونکہ آزادیٔ صحافت کے بغیر نہ معاشرہ اور تہذیب کی تعمیر ہو سکتی ہے اور نہ عوامی طاقتوں کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔"

"حضرات! یہ کہنا غلط ہے کہ اب پاکستان میں صحافت آزاد ہے۔ ایوب خاں کی پولیس اسٹیٹ کی یادگاریں ابھی تک اخبارات پر مسلط ہیں۔ عوامی مطالبے اور کڑی نکتہ چینی کے باوجود نیشنل پریس ٹرسٹ، جو اجارہ دار سرمایہ داروں، جاگیر داروں، نوکر شاہی اور حکومت کا آلہ کار ہے ابھی تک قائم ہے بلکہ اس کا سربراہ جسٹس رحمان جیسے عوام دشمن اور رجعت پسند شخص ہے۔ پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس کی تلوار ابھی تک صحافیوں کے سروں پر لٹک رہی ہے۔ اب بھی اخبار اور رسالے کے ڈیکلریشن کے لئے خفیہ پولیس کی اجازت ضروری ہے۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس، نیشنل پریس ٹرسٹ اور پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈی ننس کو آزادیٔ صحافت اور جمہوریت کے منافی سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس نافذ کیا گیا تو صحافیوں نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ قراردادیں منظور کیں۔ احتجاجی جلسے کئے، کالے بلے باندھے اور پلے کارڈز اٹھا کر ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جلوس نکالے۔ لیکن اس وقت سیاسی رہنماؤں اور دوسرے طبقوں نے صحافیوں کا ساتھ نہ دیا۔ نتیجتاً تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ اسی طرح نیشنل پریس ٹرسٹ کی مخالفت کی۔ ۱۹۶۸ء کی عظیم عوامی تحریک کے دوران صحافیوں نے اپنے معاشی مسائل پیش کرنے کے بجائے آزادیٔ صحافت، پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈی ننس کی تنسیخ اور نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت جماعت اسلامی اور نوابزادہ نصراللہ خاں نے بھی ان مطالبات کی حمایت کی تھی۔ لیکن آج یہی لوگ ان کی مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام دشمن اور رجعت پسند طاقتیں عوامی بیداری سے خائف ہیں۔ یہ پوری فکر کو پابند کرنا چاہتی ہیں۔ سرمایہ داروں کے اخبارات اور نیشنل پریس ٹرسٹ ان کے مکروہ عزائم کو بخوبی عملی روپ دے سکتے ہیں۔"

"دوستو! دوسرا مسئلہ جو صحافت کو درپیش ہے وہ یہ کہ عوام دشمن اور سامراج نواز عناصر نے صحافیوں کی ملک گیر ہڑتال کے بعد سیاسی بنیادوں پہ تطہیر شروع کر دی۔ تقریباً ۱۵۰ صحافیوں کو جماعت اسلامی کے اشارے پہ نوابزادہ شیر علی خاں کی ہدایت پہ بیروزگار کیا گیا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اس اقدام کی پُرزور مذمت کرتی ہے۔ کیونکہ سیاسی بنیادوں پہ تطہیر بالکل ناجائز اور آزادیٔ صحافت کے منافی ہے۔ جس طرح ایک عام شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چاہے مسلم لیگ میں شامل ہو یا جماعت اسلامی کا ہمنوا بن جائے۔ اسی طرح صحافیوں کو بھی بحیثیت شہری یہ موقع ملنا چاہیئے۔"

"تیسرا مسئلہ جو فوری طور پر توجہ کا محتاج ہے وہ یہ کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کی انتظامیہ نے صرف ماہ دسمبر میں ۱۵ کارکنوں کو ملازمت سے برطرف کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ مزید ملازمین کو علیحدہ کرنے کی دھمکی دی ہے۔ ان برطرف ہونے والوں میں ایسے افراد ہیں۔ جنہوں نے اپنی عمر عزیز کا ایک طویل حصہ پی پی ایل کو پاکستان کا سب سے بڑا اخباری ادارہ بنانے میں صرف کیا ہے۔ انتظامیہ کے بقول یہ برطرفیاں "مالی بچت" کے پیش نظر کی جا رہی ہیں۔ لیکن انتظامیہ پی پی ایل کے ۶۰ لاکھ روپے کے واجبات جن میں ۱۷ لاکھ روپے روزنامہ مشرق پر ہیں۔ ابھی تک وصول نہیں کر سکی ہے۔ اس کے علاوہ پی پی ایل ۳ لاکھ روپے سالانہ سروس چارج ٹرسٹ کو ادا کرتا ہے۔ اگر یہ واجبات وصول کر لئے جائیں تو پی پی ایل نہ صرف منافع بخش ادارہ بن سکتا ہے بلکہ ملازمین کو زیادہ مشاہرے اور سہولتیں مہیا کی جا سکتی ہیں۔ پی پی ایل کے ان کارکنوں کی برطرفی بظاہر اتنی اہم نہیں۔ لیکن اگر یہ جان لیا جائے کہ یہ ملک کے تمام مزدوروں کے خلاف کی جانے والی سازش کا ایک حصہ ہے تو اس واقعے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ محض چند اخباری کارکنوں کی برطرفی کا مسئلہ نہیں بلکہ ملک کے تمام صنعتی اداروں سے محنت کشوں کو جو برطرف کیا جا رہا ہے، صحافیوں

برنا صاحب ملازمت سے برطرف ہوئے تو کسی نے کوئی آواز بلند نہ کی

کی برطرفی بھی انہی کا ایک حصہ ہے۔ برحق مانگنے والی زبانوں پر پہرہ بٹھانے اور حقوق کے لئے جدوجہد کرنے والے محنت کشوں کو خاموش کر دینے کا مسئلہ ہے۔ اسی لئے پی پی ایل ورکرز یونین کے صدر جناب صفدر میر نے جو ملک کے ممتاز کالم نویس اور ادیب ہیں ۶ جنوری سے تا مرگ بھوک ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کے ساتھ ایک چوکیدار اور ایک چپراسی بھی بھوک ہڑتال میں شریک ہو رہے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ضروری ہے کہ آپ لوگ اپنی بساط بھر امداد و تعاون کریں تاکہ حقوق کی جدوجہد کرنے والوں کو ڈرا دھمکا کر خاموش کرنے کی جو روایت سرمایہ داروں نے قائم کی ہے۔ جسے باطل کیا جا سکے۔"

یہ تقریر پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے سیکرٹری جنرل جناب منہاج برنا نے کی تھی۔ وہ ۵ جنوری کی سہ پہر کو کراچی پریس کلب میں انجمن صحافیان کراچی کے عہدے داروں اور ارکان سے مخاطب تھے۔ منہاج برنا صحافیوں کی ٹریڈ یونین تحریک کی ایک تاریخ ہیں۔ مغربی پاکستان میں صحافیوں کی ٹریڈ یونین تحریک کا آغاز سندھ یونین آف جرنلسٹس سے ہوا تھا۔ اس یونین کے قیام میں، جو صحافیوں کے لئے ایک سنگ میل ثابت ہوئی، برنا صاحب پیش پیش تھے اور پھر وفاقی انجمن صحافیان پاکستان کی بنیادیں رکھنے میں آگے آگے تھے اور صرف برنا صاحب ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ مشرقی پاکستان سے انہیں وفاقی انجمن صحافیان پاکستان کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا تھا۔ انجمن صحافیاں کراچی کے اس اجلاس میں وہ صحافیوں کی ٹریڈ یونین تحریک اور آزادی صحافت کے لئے دی جانے والی قربانیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ پاکستان میں صحافت کبھی آزاد نہیں رہی۔ ایوب خاں سے پہلے بھی آزادی صحافت اور صحافیوں کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے حکومت اور مالکان اخبارات نے طرح طرح کے حربے استعمال کئے۔ یونین کے سرگرم کارکنوں پر روزگار کے دروازے بند کئے گئے۔ بعض کے تبادلے مشرقی پاکستان کئے گئے اور کچھ کو دیار غیر بھیجا گیا۔ جناب عبدالشکور اور ایک رحیم کو وطن عزیز سے جلا وطن کیا گیا۔ حکومت اور مالکان اخبارات نے وفاقی انجمن صحافیاں پاکستان کی تحریک کو دبانے کے لئے پاکٹ یونین بھی بنائی۔ لیکن ان تمام مصائب کے باوجود پی ایف یو جے آج بھی ان ہی اصولوں کی پرچارک ہے جن پر پہلے تھی۔

انجمن صحافیاں کراچی کا یہ اجلاس تقریباً چھ ماہ کے تعطل کے بعد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو صحافیوں کی ملک گیر ہڑتال کے بعد ٹریڈ یونین سرگرمیوں سے عتاب ہو کر اور مالکان اخبارات سے معافی مانگ کر اپنی ملازمتوں پر بحال ہو چکے تھے اور ایسے احباب بھی تھے جو یونین کے عہدے داروں اور سرگرم کارکنوں کو دیکھ کر راستہ بدل دیا کرتے تھے۔ اس اجلاس میں مسٹر اقبال جعفری نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ جناب منہاج برنا صرف پی پی ایل کے کارکنوں کی بھوک ہڑتال کے سلسلے میں کراچی آئے ہیں اور انہیں کراچی کے صحافیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مسٹر اقبال جعفری نے پوچھا کہ "وفاقی انجمن صحافیاں پاکستان ملک گیر ہڑتال کے بعد بے روزگار ہونے والے صحافیوں کے لئے کیا کر رہی ہے؟ پی پی آئی کے برطرف شدہ صحافیوں کی بحالی کے لئے کیا کیا اقدامات کئے ہیں؟" برنا صاحب نے ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ وفاقی انجمن صحافیان پاکستان نے ہڑتال کے آخری دن اپنی ایک قرارداد کے ذریعے اپنی ذیلی تنظیموں کو مقامی حالات کے مطابق معاہدہ، سمجھوتہ اور اقدام کرنے کا حق دے دیا تھا اور پی پی آئی کے لئے ایک کمیٹی تشکیل کر دی تھی۔ اس کے علاوہ پی ایف یو جے، بے روزگار ہونے والے صحافیوں کو ملازمتیں دلوانے اور بحال کروانے کے لئے اپنی بساط بھر کوششیں کیں، مقدمات لڑے، چند میں جیتے، کچھ میں ہارے اور بعض ابھی تک چل رہے ہیں۔ برنا صاحب نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی بے روزگار ہیں۔ پاکستان ٹائمز سے برطرف ہونے کے بعد روزنامہ "سن" میں ملازمت ملی تھی۔ دو ماہ کے بعد وہ بھی جاتی رہی۔

اس کے بعد جناب ظفر رضوی جنرل سیکرٹری انجمن صحافیان کراچی نے مسٹر اقبال جعفری کو یاد دلایا کہ آپ نے ہڑتال کے بعد خود ہی کہا تھا کہ پی پی آئی کے معاملات ہم خود طے کرلیں گے۔ اور جب آپ کو روزنامہ "سن" میں ملازمت مل گئی تو میں خود آپ کے پاس گیا تھا اور یونین کے معاملے پر گفتگو کی تو یہ جواب ملا "ظفر بھائی کیا اب یہاں سے بھی برطرف کروانا چاہتے ہیں۔"

یاد رہے مسٹر اقبال جعفری جو اس اجلاس میں پی ایف یو جے اور کے یو جے کی قیادت کے خلوص پر شبہ ظاہر کر رہے تھے۔ پی پی آئی سے برطرف ہونے کے دو ماہ بعد ہی روزنامہ "سن" میں ملازم ہو گئے۔ جناب منہاج برنا کو ان کے بعد "سن" میں ملازمت ملی۔ لیکن جب سن میں تطہیر کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کا پہلا نشانہ برنا صاحب بنے۔ تو مسٹر اقبال جعفری اور "سن" کے دیگر صحافی جن میں کے یو جے کے ارکان اور بعض پی ایف یو جے کے عہدے دار بھی شامل ہیں خاموش رہے اور انتظامیہ کے خلاف ایک آواز تک نہ نکالی۔ خطرہ تھا کہ برنا صاحب کی حمایت کی تو مبادا ملازمت سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔ اس طرح انہوں نے مصلحت کو اصولوں پر فوقیت دی۔ اور اب اجلاس میں وہی مصلحت پسند اس منہاج برنا پر اعتراضات اور اس کے خلوص پر شک کر رہے تھے۔ جس کی پوری زندگی جدوجہد سے عبارت ہے۔ اور جس نے کبھی اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ذرا برنا صاحب کا کردار دیکھئے کہ وہ ابھی تک بے روزگار ہیں۔ وہ اپنی بے روزگاری کا ذکر کسی سے نہیں کرتے۔ کیونکہ بات ملازمت کی نہیں بلکہ اصولوں کی ہے۔ اور وہ لوگ جو اب برسر روزگار ہو چکے ہیں اب بھی اپنی بے روزگاری کا رونا روتے ہیں۔ ع

اس پر مچلے ہیں کہ زخم جگر دیکھیں گے

اے پی این ایس کے اخباری وڈیروں میں آجکل جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔یوسف ہارون کے شام کے اخبار ایوننگ اسٹار کے صفحہ اول پر جنگ کے مالک میر خلیل الرحمٰن کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "بازارِ صحافت کی طوائف" ہم اس مضمون کو ایوننگ سٹار کے شکریہ کے ساتھ جوں کا توں شائع کر رہے ہیں (ادارہ)

دوغلے پن سے باز آجاؤ ورنہ فکس اَپ کر دیا جائے گا

کراچی میں مسٹر زیڈ۔ اے بھٹو کے حالیہ قیام کے دوران ان سے میر خلیل الرحمٰن کی ملاقات کے بارے میں بہت سی باتیں سنی گئی ہیں۔ ان تمام باتوں کی جانچ پڑتال کے بعد دونوں کی ملاقات کے دوران گفت و شنید کی تفصیل ترتیب دی گئی ہے۔ کسی سرکاری ترجمان کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان مکالموں کو باضابطہ طور پر دوبارہ ترتیب دینا پڑا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان مکالموں کی ہماری دی ہوئی ترتیب میں کوئی خامی نہیں ہے۔ تاہم اگر مسٹر بھٹو یا میر خلیل الرحمٰن، دونوں میں سے کوئی صاحب ان میں کوئی وضاحت کرنا چاہیں تو ہم اسے بخوشی دوبارہ شائع کریں گے۔

یہ بات یقینی ہے کہ مسٹر بھٹو نے "جنگ" کے مالک میر خلیل الرحمٰن سے ۱۲؍دسمبر کو ان کے شام کے انگریزی اخبار "ڈیلی نیوز" میں شائع ہونے والی اس کی ایک خبر کے بارے میں جواب طلبی کی۔ اس سلسلے میں جو مکالمے ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:-

بھٹو: خلیل! تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

خلیل الرحمٰن: جناب میں آپ کو مبارکباد دینے حاضر ہوا تھا۔ میں ......

بھٹو: (بات کاٹتے ہوئے) ایک منٹ ٹھہرو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ "ڈیلی نیوز" میں شائع ہونے والی خبر کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ کیا تم مجھ سے بھی دوغلاپن برتنے کی کوشش کر رہے ہو؟

خلیل الرحمٰن: نہیں جناب۔ یہ خبر میری مرضی و منشاء کے خلاف شائع کی گئی تھی۔ مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا۔ میں اس سلسلے میں خدا کی قسم کھا سکتا ہوں لیکن میں ذمہ دار افراد کے خلاف ضروری کارروائی کر رہا ہوں۔

بھٹو: ہوں! تم نے اپنا پرانا کھیل پھر کھیلنا شروع کر دیا ہے۔

خلیل الرحمٰن: جی نہیں، ایسا بالکل نہیں ہے۔ آپ جس چیز کی چاہیں میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔

بھٹو: تمہیں معلوم ہے کہ ایوب خاں نے تمہارے بارے میں کیا رائے قائم کی تھی؟

خلیل الرحمٰن: وہ تو صاحب آمر تھا، ڈکٹیٹر تھا۔ اس نے آزادیٔ صحافت ختم کر کے رکھ دی تھی۔

بھٹو: کچھ بھی ہو اس نے منگلا ڈیم تعمیر کر کے اور تمہیں پی جے ایف (P.J.F) کا خطاب دے کر جو دو اہم خدمات انجام دی ہیں ان کی وجہ سے وہ ایک عرصہ تک یاد رکھا جائے گا۔

خلیل الرحمٰن: جی میں سمجھا نہیں۔ یہ "پی جے ایف" کیا چیز ہے۔

بھٹو: مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرو۔ اس نے ملک کے مختلف اخباروں کے ۲۵ مدیروں کی موجودگی میں تمہیں "بازارِ صحافت کی طوائف ... (PROSTITUTE OF JOURNALISTIC FRATERNITY) کا ٹائیٹل دیا تھا۔ کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو؟'

خلیل الرحمٰن: جناب آپ میرے ساتھ زیادتی فرما رہے ہیں۔ آپ کے علم میں شاید یہ بات نہیں ہے کہ میں نے 'جنگ' کے صفحۂ اوّل پر آپ کی چار پانچ تصاویر شائع کی ہیں، اور انتخابات کے دوران آپ کی پوری حمایت کی ہے۔ میرا خیال ہے آپ اس سے انکار نہیں کریں گے۔

بھٹو: ہاں! اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انتخابی مہم کے ابتدائی مراحل میں جب تمہارے مفادات جماعتِ اسلامی کے ذریعے تحفظ پا رہے تھے تو تمہارا 'جنگ' اس کا ترجمان بنا ہوا تھا۔ میں تم جیسے گرگٹوں سے اچھی طرح واقف ہوں میر ـــــ!

میر خلیل الرحمٰن

خلیل الرحمٰن: جناب میں نے بعد میں بھی جنگ کے صفحۂ اول پر آپ کی چار پانچ تصاویر شائع کی تھیں اور آپ جانتے ہی ہیں کہ جنگ کے صفحۂ اول کا نرخ ۶۴ روپے فی کالم انچ ہے۔

بھٹو: مجھے اپنے نرخناموں سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ پیسے کی ہوس کی وجہ سے تم یہودی مشہور ہو۔ تم ایک روپے کی خاطر اپنے آپ کو بھی ڈبل کراس کرنے سے نہیں رہ سکتے۔ لیکن کیا اس پہلے تم ایوب خاں کی بھی چار چار پانچ پانچ تصویریں نہیں چھاپتے رہے ہو؟ اور ہاں اس موقعہ پر مجھے نواب کالاباغ مرحوم یاد آ رہے ہیں جنہوں نے تمہارے لئے "رنڈی" کا لفظ استعمال کیا تھا۔

خلیل الرحمٰن: لیکن جناب کالاباغ تو آپ کا پکا دشمن تھا۔

بھٹو: ہاں باہمی طور پر ہمارے کچھ اختلافات تھے لیکن کوئی بھی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرحوم کو آدمی کا کردار پرکھنے میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ ہمیشہ تمہارے بارے میں کہا کرتے تھے کہ "جنگ" کی ... اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کے لئے تمام حدیں پھلانگ سکتی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ رتی برابر بھی غلط نہیں کہتے تھے۔

خلیل الرحمٰن: جناب میں شرمندہ ہوں — مجھے افسوس ہے اور میں آپ سے دست بستہ معافی مانگتا ہوں — میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس شخص کو برطرف کر دوں گا جس نے آپ کے خلاف خبر تیار کی تھی۔

بھٹو، اس پر مجھے تمہاری ایک اور برطرفی یاد آ رہی ہے۔ تم نے "ڈیلی نیوز" کے پرانے ایڈیٹر ضمیر صدیقی کو بھی برطرف کیا تھا اور شاید ان کے ڈیوز بھی ابھی تک ادا نہیں ہوئے ہیں اور یہ سب کچھ ایوب خاں کو خوش کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے دفتر میں رات گئے تک بیٹھتے ہو اور چھوٹے چھوٹے اشتہارات تک ذاتی طور پر وصول کرتے ہو۔ چالاکی میں واقعی تمہارا کوئی ثانی نہیں ہے۔

خلیل الرحمٰن: جناب میں ملک کے سب سے زیادہ چھپنے والے اخبار کا مالک ہوں اور اسی وجہ سے لوگ مجھ سے رشک اور حسد کرتے ہیں۔

بھٹو: سب سے زیادہ چھپنے والے اخبار کے مالک ہو تو پھر اس وقت عورتوں کی طرح آنسو کیوں بہا رہے تھے جب ایوب خاں نے تمہیں" بازار صحافت کی طوائف" کا لقب دیا تھا؟

خلیل الرحمٰن: جناب۔ دراصل ہمارے اور آپ کے تعلقات کی نوعیت سیاسی نہیں ہے۔ ہم ذاتی دوست ہیں۔ کیا ہم ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کر سکتے؟

بھٹو: ہوں — تم میرے ذاتی دوست ہو سکتے ہو۔ تم جو ایک زمانے میں فخر ماتری مرحوم کی دوستی کا بھی بڑا دم بھرا کرتے تھے لیکن تم نے ان کے خلاف ہر قسم کی جاسوسی کی اور ایوب خاں سے ان کی شکایتیں کیں۔ تم نے اپنے ایسے اور بہت سے دوستوں کے ساتھ بھی دو غلے پن کے مظاہرے کئے اور شاید یہی تمہاری کامیابی کا راز بھی ہے لیکن تم نے اگر میرے ساتھ یہ کھیل کھیلنے کی کوشش کی تو میں تمہیں اس بری طرح فکس اپ کروں گا کہ تمہاری نسلیں اسے یاد رکھیں گی۔ جاؤ —! اس دروازے سے باہر نکل جاؤ اور اپنے پھکن درست کرو۔"

✱

عوامی امنگوں کو سبوتاژ کرنے والوں کو عوام سزا دیں گے

صفحہ ۱۲ سے آگے

پسندوں سے اتحاد نہیں کر پائیں گے اور مرکز میں باقی چار صوبوں کو نمائندگی دینے کا مسئلہ صرف اور صرف ان سیاسی جماعتوں کے تعاون سے حل کر سکیں گے جن کا اقتصادی پروگرام سوشلزم یا اسلامی سوشلزم ہے۔ بورژوا سیاست میں کندہم جنس باہم جنس پرواز' والی بات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

پیپلز پارٹی کی بعض غیر ذمہ دار اور مسٹر بھٹو کی بے پناہ مقبولیت کی غلط پیداوار شخصیات نے اپنے قول و فعل کے ذریعے ملک گیر سطح پر نہ صرف مسٹر ذوالفقار علی بھٹو بلکہ مجموعی طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کو زبردست نقصان پہنچایا ہے' انہوں نے پارٹی کا فیصلہ ہوتے ہوئے انتخابات کے دوران گٹھ جوڑ کچھ اس انداز سے کیا کہ وہ ری پبلکن پارٹی کے کارکن یا ان کی تربیت یافتہ اولاد معلوم ہوتے تھے۔ نثار خاں نے شمالی ہشت نگر کے کسانوں کی جائز اور کٹھن جدوجہد میں جو گھناؤنا اور بھیانک کردار ادا کیا اس سے پاکستان پیپلز پارٹی کو صوبہ سرحد میں ناتلافی نقصان پہنچا۔ ایسا نہ ہوتا تو صوبہ سرحد میں پیپلز پارٹی کو زبردست فتح ہوتی۔ خان قیوم اور جمعیت العلمائے اسلام (ہزاروی گروپ)، کی غیر متوقع محدود کامیابیاں اور ولی نیپ کا موجودہ حال اور پیپلز پارٹی کی یہ پوزیشن نہ ہوتی۔ انتخابات سے قبل چارسدہ کے کسانوں نے بالخصوص اور باقی کسانوں نے بالعموم پیپلز پارٹی کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔ ان کے دلوں میں ولی نیپ کی جاگیردار نوازی کے خلاف نفرت موجود تھی اور آج بھی ہے' وہ خان قیوم کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ ان کے لئے صرف ایک ہی چارہ رہ گیا تھا کہ وہ کسی ایسی سیاسی جماعت سے تعاون کریں جو وطن دوست ہو اور جس کے منشور میں مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کے حل کرنے کا پروگرام شامل ہے۔ اس پیمانے پر انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنے قریب پایا۔ نثار خاں نے پیپلز پارٹی میں ہوتے ہوئے اپنے طبقے کے مفادات کی نگرانی کی اور کسان دشمنی کا بھرپور مظاہرہ کیا جب کہ مسٹر حیات شیرپاؤ کا رویہ بالکل برعکس تھا اور وہ کسانوں میں آج بھی پسند کئے جاتے ہیں پاکستان پیپلز پارٹی کو صوبہ سرحد میں بھی اتنی ہی کامیابی حاصل ہو جاتی تو رجعت پسند مفتوحہ اخبارات اور انکے سرپرست اور مالکان سرمایہ دار زندگی بھر جوڑ توڑ کا کھیل بھول جاتے۔

پنجاب اور سندھ نے ان شعبدہ بازوں پر ضرب کاری ضرور لگائی ہے اور انہیں کارنر کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ابھی ایک اور دھکے کی ضرورت ہے تاکہ پورے طور پر فکس اپ ہو جائیں۔

بھٹو اور مجیب ملاقات سے قبل یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ سیاسی شعبدہ بازوں کی خدمات سے مسٹر مجیب مستفیض نہیں ہوں گے اور چھ نکات انہیں اس بات کی اجازت بھی نہیں دیں گے' تاہم بھٹو اور مجیب مرکز کی سطح پر ایک ایسا فارمولا طے کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ملک کے دونوں حصوں کے پانچوں صوبوں کے حقوق کی نگہداشت کی ضمانت دے سکے گا۔ سرحد میں نصر اللہ خان کی نشست بھی پیپلز پارٹی کے استحکام کو تقویت پہنچانے کا موجب بن سکتی ہے کہ پیپلز پارٹی پنجاب اور سندھ کے علاوہ سرحد میں بھی ایک پوزیشن رکھتی ہے۔

اس بات کا احساس سرمایہ داروں کو ہو چکا ہے۔ وہ یوسف ہارون اور عوامی لیگی حلقوں میں اثر رکھنے کا دعویٰ کرنے والے ایجنٹوں کی رپورٹوں سے مایوس ہیں۔ اس کا نتیجہ عوام کے سامنے ہے۔ انہیں مجیب کے تعاون کا یقین مل جاتا یا مسٹر بھٹو یہ باور کرا دیتے کہ ہمارے نعرے محض انتخابی تھے۔ آپ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ بات کریں' باروں کو کیا ملے گا تو قیمتوں میں اضافہ نہ ہوتا۔ نوکر شاہی اقتدار کی منتقلی سے قبل ایسے اقدامات نہ کرتی جس سے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا ہوتا ٹیکسیوں اور رکشاؤں کی ہڑتال مزدوروں میں بے چینی اور اضطراب پر مسلسل خاموشی' مزدوروں کی اندھا دھند برطرفی پر سکتے کا عالم اور کسانوں کی بے دخلی پر چپ سادھ لینا معنی خیز ہیں۔ ظالموں نے نوشتۂ دیوار پڑھ لیا ہے اور نوکر شاہی ان کے ساتھ ہے خطرہ ٹالنے کے لئے سب کچھ کیا جا رہا ہے' اس نے دوسرا رخ اختیار کر لیا تو حالات مختلف ہوں گے۔ اس وقت شاید اسمبلیوں کے قوانین یا آرڈی ننس کی محتاجی کی ضرورت نہ پڑے اور عوامی عدالتیں خود فیصلہ کریں کہ عوامی امنگوں کو سبوتاژ کرنے والوں کو کیا سزائیں ملنی چاہئیں۔

●●●

مولانا کی برقی لہریں پھر جھٹکا لے رہی ہیں

سہراب اسلم —— لاہور

یہ واقعہ صوبائی اسمبلی کے انتخاب سے چند روز پہلے کا ہے۔

لاہور کی قومی اسمبلی کے نتائج نے کاغذ کے شیر اور "سامراج پسندوں" پر جہاں غشی طاری کر دی، وہاں عوام میں یہ تاثر بھی پیدا کر دیا تھا کہ اب یہ "پسندے" اور "شیر" دوبارہ میدان میں نہیں آئیں گے۔ مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا، دھوپ لگنے سے جسم کو سینک لگا" ہڈی پسلی کا بل نکلا اور ایک بار پھر ترازو والے اور شیر والے انتخابی رنگ کی طرف لوٹے۔ اگرچہ گردن لٹکی ہوئی تھی اور آنکھ ناک پر سوجن دیکھی جا سکتی تھی۔ مگر چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ ۷ر دسمبر کو چوٹ کھانے کے باوجود یہ لوگ پھر جیپوں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر "اسلام کو خطرہ ہے" کا نعرہ لیکر میدان میں نکل پڑے۔ اس وقت ہم پرانی انارکلی سے گذر رہے تھے —— جیپ میں سے نعرہ آیا —— "خان اعظم —— شیر سرحد کے نشان .... "شیر" کو یاد رکھئے ——"

ایک نوجوان جو ہمارے قریب سے گزر رہا تھا —— حیرانگی کے عالم میں بولا —— "کمال اے بھئی .... ایتھے شیر ملدا اے .... ؟"

○

مذکورہ بالا واقعہ ہمیں بھول چکا تھا۔ یاد اس لئے آیا کہ مولانا صاحب اچھروی کے مرید تو خیاب

"پورس کاشمیری" نے ایک خط اپنی 'کاغذی چٹان' کے ماتھے پر چپکایا ہے۔ یہ خط دراصل ایک اور 'خط' کا جواب ہے۔ پہلا خط 'پورس کاشمیری' نے انتخاب کے نتائج کے نتیجہ میں 'پیر تو' کے حضور لکھا تھا۔ یہ خط کم مرثیہ زیادہ تھا۔ ایک نقرہ ملاحظہ ہو ——

۷ر دسمبر .... مخدومی مولانا .....
سلام مسنون ..... نتائج کے بعد دماغ میں سوالات کا ایک ہجوم ہے۔ ابھی خود انہیں چھانٹ رہا ہوں۔ جو بچ رہے عرض کروں گا۔ ہم نئی پود سے غافل تھے۔ نتیجۃً اس نے ہمیں مسترد کر دیا ہے اور اگر صورت حال کا ہم ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ کر سکے تو اب اس دیرانے میں ہم کہاں تک اذان دے سکتے ہیں ..... ؟"

بظاہر یہ دو زخم خوردہ نیم ملا نیم سیاست والوں کا نجی معاملہ ہے۔ عام طور پر مہذب لوگ کسی کی خط و کتابت میں دخل نہیں دیتے۔ یوں بھی دشمن کے مرنے پر خوشی کرنے کا رواج مستحسن نہیں سمجھا جاتا —— لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ صاف مرتے بھی نہیں صاف جیتے بھی نہیں؟ ڈھارس بندھاتے ہوئے اور آنسو خشک کرنے کے لئے اپال پیش کئے بغیر "مخدومی مولانا" صاحب فرماتے ہیں .....
"لوگوں کی اکثریت اگر اندھیروں میں بھٹکنا اور ٹھوکریں کھانا چاہتی ہے تو خوشی سے بھٹکے اور ٹھوکریں کھاتی رہے —— ہمارا کام بہرحال اندھیروں میں چراغ جلانا ہے۔"

اسے کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا .... آنکھوں کا اندھا نام روشن دین (یہ نیا محاورہ ہے) اندھیروں کا پجاری —— تاریکی کا پیمبر .... اور! اگر "مخدومی مولانا" —— اجازت ہو تو آئینہ دیں .... لیجئے یہ ہفت روزہ شرمندگی کا ۷ر دسمبر تا ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۰ء کا شمارہ ہے۔ جن عوام کو آپ گالیاں نکال رہے ہیں —— اس میں انداز گفتگو یہ تھا ....." ۷ر دسمبر وطن عزیز کی تاریخ میں ایک نئے عہد کا آغاز ہے ایک ایسا عہد ایک ایسا دور جس میں قوم کی تقدیر صحیح معنوں میں عوام کے ہاتھ میں ہوگی۔ ہر فرد فی الحقیقت ملت کے مقدر کا ستارہ بن کر چمکے گا۔"

پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے مولانا ...... مردہ روحوں سے ہم جھگڑنا نہیں چاہتے۔ یقیناً عوام کے "قاتلوں" کی روحیں اندھیروں میں بھٹکتی رہیں گی۔ اور پھر اندھیرے انہیں نگل لیں گے۔ اندھیرا صرف اندھیرے کو نگل سکتا ہے روشنی کو نہیں —— کبھی نہیں، کبھی نہیں۔

عوام نے تو مولانا مخدومی کا برج ۷ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو الٹ دیا تھا۔ لیکن ان کے اخباری لیڈروں نے اب رینگنا شروع کیا ہے۔ اور چلے بھی پہلے سر کی کھوپڑی میں ہیں۔ یعنی ۷ر دسمبر سے پہلے جو "مولانا مخدومی" عالم اسلام، پاکستان' اور خدا جانے کس کس کے محافظ و مولد بنائے گئے تھے اور جن کے نورانی چہرے کی برقی لہروں نے قاتل کے چہرے کو جھٹکا دے کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ اب اس 'بزرگ' اور عامل روحانی کے متعلق ترازو ٹوٹنے کا تجزیہ کرتے ہوئے تجزیہ نگار نے معاصر شرمندگی کے تازہ شمارہ میں لکھا ہے کہ اس کی ایک وجہ نوجوان قیادت کا فقدان ہے۔ اور یہ کہ اب مولانا مخدومی اتنے بیمار اور ضعیف ہو چکے ہیں کہ انہیں ...... خیر چھوڑیئے۔ بُرے دنوں میں انسان کا یہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ اگر 'حقارت' کے کیڑے اب "جسارت" کرنے لگے ہیں تو اسے ہر فلم کے ویلن کا منطقی انجام سمجھنا چاہیئے —— اور اب تو ویسے بھی ..... ع

ریل کا پہیہ جام کرنے والے خود جام ہو گئے

مضمحل ہو گئے قوا غالبؔ، اب عناصر میں اعتدال کہاں
قارئین الفتح عنقریب اچھرہ سے ایک دل خوش کن خبر کے منتظر ہیں —— ! "مخدومی سیاست سے ریٹائر ؟"

○

آج کل لاہور کے قہوہ خانوں میں مہنگائی کے باوجود خاصی رونق رہتی ہے۔ چند روز پہلے ہمیں بھی ایک قہوہ خانے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بات ہونے لگی اس مزدور کانفرنس کی جو لسبٹ روڈ کے مجوزہ لیبر ہال میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں مزدوروں کی مختلف تنظیمیں آپس میں مل بیٹھی تھیں —— یعنی کانفرنس میں شرکت کی حد تک۔ اس کانفرنس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ سال گذشتہ کے آغاز میں، منعقدہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے مرزا ابراہیم نے مولانا بھاشانی کی ہڑتال کی کال کے جواب میں ریل کا پہیہ جام کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اسی ترنگ میں بشیر بختیار نے اعلان کر دیا کہ وہ کسان کانفرنس کی طرز پر لاہور میں ملکی سطح پر مزدور کنونشن بلائیں گے۔ ارادہ نیک تھا۔ سب کو خوشی ہوئی۔ جب ریل کا پہیہ جام کرنے والے خود جام ہو گئے اور ۱۹ر اپریل کی بھاشانی نیپ کی ہڑتال کی کال فیل ہو گئی تو بشیر بختیار صاحب نے بھی اپنے اعلان کو بھلا دیا۔ مگر جب ان کی لیبر پارٹی ٹھنڈی پڑی تو انہیں یاد آیا کہ "پاکستان بھر کے مزدور متحد ہو جاؤ!"

۲۷ر دسمبر کو لاہور میں مذکورہ کانفرنس منعقد ہوئی جو کئی لحاظ سے اہم ہے اور ابھی تک قہوہ خانوں میں موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مزدوروں کی پرانی قیادت اب اس قابل ہے کہ نئے تقاضوں کے ساتھ چل سکے۔ فضل الٰہی قربان، مرزا ابراہیم، دارا امیر حیدر، بشیر بختیار —— اور اسی قبیل کے بہت سے محترم دوست بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کے دم خم کی مجموعی طور پر تعریف کرنی چاہیئے کہ اس پیرانہ سالی میں بھی یہ لوگ کام کر رہے ہیں۔ مگر جس دیئے میں تیل نہ ہو اسے جلنے کا کیا ادھیکار؟

○

حالات نے جس تیزی سے پلٹا کھایا ہے اس کے مقابلے میں سیاسی سوچ کے پیمانے نہیں بدلے۔ صورت حال یہ ہے کہ ملک میں اقتصادی لحاظ سے سوشلزم کے پروگرام پہ ریفرنڈم ہو چکا ہے۔ سوشلزم کوئی ایسی انوکھی بجھارت تو ہے نہیں کہ لوگوں کو اس کا جواب نہ آتا ہو۔ میری بحث چائے کے کپ میں انقلاب برپا کرنے والوں سے نہیں ہے۔ جب سوشلزم آتا ہے تو وہ جہاں اور بہت سی خوشیوں کے پھول عوام کے لئے لاتا ہے، وہاں جشن مرگ خزاں ہی کو ہی جشن بہاراں نہیں سمجھاتا۔ پیپلز پارٹی کی کامیابی اس کے پروگرام اور نوجوان قیادت کی رہین منت ہے مگر جو کچھ اخبارات میں آ رہا ہے، وہ کسی طرح بھی پیپلز پارٹی کے دوستوں کے لئے قابل اطمینان نہیں ہے۔ ممبران اسمبلی اپنے حواریوں سمیت انفرادی جشن منانے میں مصروف ہیں۔ وہی "خطبہ استقبالیہ" اور وہی رسمی "اظہار تشکر"۔ گیندے اور گلاب کے پھول، تلے کے ہار، اخباری فوٹو گرافروں کی بھرمار، خوشامدیوں کے میلے ٹھیلے —— اور بائیں بازو کے اخبارات کے ایک حصہ کی ضرورت سے بڑھی ہوئی تعریف و توصیف۔ ہمارے محترم دوست اس نشاندہی پہ بے شک ہمیں معاف نہ فرمائیں کہ اس فرض کو ہم نبھاتے رہے ہیں اور نبھانے کا عزم رکھتے ہیں —— کیا سوشلسٹ اور ریگیوں کے انتخاب کی کامیابی میں کوئی فرق ہے؟ کیا ایوب خاں کے دور کے روایتی سانچے ہماری جان نہیں چھوڑ سکتے؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اخبارات میں تصاویر چھپوانے کی بجائے براہ راست عوامی محاذ پہ عوام کی خدمات کا کام شروع کیا جائے۔ مثلاً مہنگائی کو روکنے کے لئے مارشل لا حکام اور عوام کے درمیان رابطہ۔ کیا خدمت کے لئے وزارت کی کرسی شرط ہے؟ یہ سوالات اس لئے بھی ضروری ہیں کہ چیئرمین بھٹو نے خود بھی اپنے نومنتخب اراکین اسمبلی کو یہی ہدایت کی ہے کہ اچکن سلوانے کی بجائے عوام میں جا کر ان کی خدمت میں مصروف ہو جاؤ۔ مگر اس کا ردعمل ......؟

ملک میں جو ایک بہت بڑی تبدیلی آ چکی ہے اس کو قبول کرنے اور ہر سطح پر لے جانے کے لئے ضروری ہے کہ مذکورہ بالا افراد اپنے اپنے علاقوں میں ابھی سے ہر عوامی محاذ پر ممکنہ حد تک عوام کے دکھوں کا مداوا کریں۔ اس سلسلہ میں اقتدار کے انتقال کا انتظار نہایت خطرناک ہو گا۔ کیونکہ عوام اپنی جدوجہد کا ثمر جلد سے جلد چاہتے ہیں۔ انہیں "دشمنوں" کے پراپیگنڈے کے رحم و کرم پر چھوڑنا کسی صورت میں دانشمندی نہیں ہے۔ "کامیابی" کی تو ابھی ابتدا ہونا باقی ہے۔ جشن "کامیابی" چہ معنی دارد؟

○

پی پی ایل میں ایک بار پھر حالات غیر معمولی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان سطور کی اشاعت تک وہاں کوئی نہ کوئی دھماکہ ہو چکا ہو۔ قرائن سے تو کم از کم اندازہ ہو رہا ہے۔ ممکن ہے رحمٰن صاحب رخصت ہو جائیں۔ یا ٹرسٹ ہی ٹوٹ جائے۔ بہرحال ایک بات یقینی ہے کہ سیاہ صحافت کے خاتمے کا وقت قریب ہے —— اور "سامراج پسندوں" کا یہ محاذ بھی جلد خاموش ہونے والا ہے۔ یا جن توپوں سے عوامی یلغار کو روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کو لاہور کے عجائب گھر میں رکھنے کا وقت قریب آ چکا ہے۔ اس لئے کہ توپ چلانے والا طوطا اڑ چکا ہے۔ اب تو بس اس کی یادوں کی دھول اڑ رہی ہے۔ رحمٰن بابا اور صحافی مار ...... نزع کے عالم میں ہیں۔ لاہور کے عوام بلکہ پاکستان بھر کے عوام مظلوم صحافیوں کے ساتھ ہیں۔

○

جماعت نے ظالموں کے اتحاد سے انتخاب لڑا تھا

ڈیرہ غازی خان — عامر فہیم ثناء اللہ

ڈیرہ غازیخان نے اس الیکشن میں خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ اس علاقے سے ہی جماعت اسلامی کو قومی اور صوبائی اسمبلی کے لئے ایک ایک سیٹ ملی ہے اس وقت جبکہ پورے پاکستان نے جماعت کو مسترد کر دیا یہاں سے وہ کیوں جیتی ہے جواب تفصیلی تجزیہ کا ہے۔ ڈیرہ غازیخان ایک پس ماندہ علاقہ ہے۔ اور اسے پس ماندہ بنانے میں موجودہ نوابوں اور سیاسی ناخداؤں کا بے حد ہاتھ ہے۔ اس ضلع کی چار تحصیلیں ہیں۔ تونسہ۔ ڈیرہ غازیخان۔ جامپور اور راجن پور۔ تونسہ میں خواجہ سلیمان تونسویؒ کا مزار ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے گدی نشینوں کو اس تحصیل میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اقتدار کے لئے ان لوگوں میں بھی دھڑے بنے ہوئے ہیں۔ خواجہ نظام الدینؒ صاحب نے پاکستان بننے کی بے حد مخالفت کی تھی وجہ صرف یہ تھی کہ اس ملک کے بننے سے ہندوستان میں ان کے مریدوں کا ایک بہت بڑا حلقہ ان سے کٹ جاتا تھا۔ اس کے یہاں تُمن داروں اور کھوسوں کا بے حد زور ہے۔ ڈیرہ غازیخان میں لغاریوں کا زور ہے۔ ان لوگوں کو سابقہ حکومتوں اور بدیسی حکومتوں کی خدمات کے بدلے بے پناہ دولت اور زمینیں ملی ہیں۔ جامپور بھی ان کے زیر اثر ہے۔ تاہم دریشک اور پتافی کافی اثر رکھتے ہیں راجن پور مزاریوں کا حلقہ بدوش ہے۔ اوجھان ان کا گڑھ ہے۔ مزاریوں کے پاس بے حد دولت ہے۔ اس کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایوب حکومت نے جب انتخابات کرائے۔ تو میر بلخ شیر مزاری کا نشان کلہاڑا تھا۔ جب وہ جیت گئے تو انہوں نے سونے کا کلہاڑا بنوا کر جلوس نکالا تھا۔

تونسہ اور ڈیرہ غازیخان کی سیٹ سے قومی اسمبلی کے لئے خواجہ قطب الدین سیالوی (جمعیت علمائے پاکستان) نوابزادہ محمد خان (آزاد) شریف کھوسہ آزاد ڈاکٹر نذیر احمد (جماعت اسلامی) شیخ سجاد حیدر (آزاد) مولانا عبدالستار تونسوی (جمعیت علمائے اسلام ہزاروی گروپ) اور منظور احمد خان لُنڈ (پیپلز پارٹی) امیدوار تھے۔ خواجہ قطب الدین کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ جن میں زیادہ تعداد ان کے مریدوں کی ہے ان کا بے حد اثر ہے۔ ان کے مقابل محمد خاں لغاری تھے انہوں نے اس الیکشن میں بے حد روپیہ خرچ کیا وہ برسوں سے اس سیٹ پر قابض چلے آرہے تھے اور اس بار بھی اسی وہم میں تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب کے بیٹے اور ماں کو اپنی حمایت میں لے لیا۔ انہوں نے اخبارات میں بیانات بھی دیئے۔ اور خواجہ صاحب

> انہوں نے انتخابی
> مہم میں
> اپنی پرانی
> سائیکل
> استعمال کی
> ہے

کے خلاف ڈیرہ غازیخان میں لغاریوں کی سٹیج پر استعمال کیا۔ اس جلسہ کا حال بھی دلچسپ ہے۔ لوگوں نے ان کی تقریر سننے کی بجائے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ پیپلز پارٹی زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔ محمد خان آگے بڑھے اور چیخے "پولیس... پولیس کہاں ہے۔ میں سابق کمشنر ہوں ان لوگوں کو قابو میں رکھو"۔ مگر لوگ چپ ہونے کی بجائے واک آؤٹ کر گئے۔ اور جلوس "پیپلز پارٹی زندہ باد، بھٹو آوے ای آوے، بھٹو جیوے صدر بھٹو جیوے" کے نعرے لگاتا آگے بڑھ گیا۔ یوں اس گروپ کا بھی جنازہ نکل گیا۔ شریف خان کھوسہ اگرچہ آزاد ممبر تھے۔ مگر ڈاکٹر نذیر کو کھوسوں کی حمایت حاصل ہونے کی وجہ سے کمزور پوزیشن میں تھے۔ عبدالستار تونسوی کا بڑا زور تھا۔ مگر جب مفتی محمود نے مودودی سے معاہدہ کیا تو وہ بے چارے بالکل بے بس ہو کر رہ گئے۔ دوسرے جماعتِ اسلامی نے عبدالستار تونسوی اور شریف خاں کھوسہ کے اپنے حق میں بیٹھ جانے کا بے حد پروپیگنڈا کیا۔ شیخ سجاد حیدر آزاد امیدوار تھے۔ ان کے والد شیخ فیض محمد بہت معروف آدمی گزرے ہیں۔ وہ اسمبلی کے سپیکر رہ چکے ہیں۔ وہ ترقی پسند خیالات رکھتے ہیں۔ پیپلز پارٹی پہلے انہیں کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ بہت دیر بعد اپنی فہم پر روانہ ہوئے منظور احمد خان لُنڈ بے حد غریب آدمی ہیں لیکن بہت مقبول ہیں۔ وہ دیہاتوں میں پہاڑوں میں اپنی ٹوٹی پھوٹی سائیکل پر کنویسنگ کے لئے جاتے تھے۔ اس موقع پر بے شمار لوگ پہلے سے استقبال کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔

جماعت کو دوست محمد تُمن دار ذوالفقار کھوسہ ، اور میر بلخ شیر مزاری کی زبردست حمایت حاصل تھی مشتاق گورمانی نے بھی اپنا اثر استعمال کیا۔ وہ "کالے" میں جماعت کے پولنگ ایجنٹ تھے۔ لیکن وہاں جماعت بُری طرح ہاری۔ پہاڑ میں اور میدان پر کھوسوں کی مکمل عملداری ہے، وہ اس علاقے کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ لوگ ان کے پنجے میں بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اگر اف کرتے ہیں تو ان کے بیوی بچوں کی خیر نہیں رہتی۔ اس لئے ان کی ہمدردیاں تمام تر پیپلز پارٹی کے ساتھ تھیں، لیکن وہ مجبور تھے۔ اس لئے وہ کچھ نہ کر سکے۔

بظاہر مقابلہ ڈاکٹر نذیر، محمد خاں اور خواجہ قطب الدین سے ہوتا نظر آتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ مقابلہ ڈاکٹر نذیر، خواجہ قطب الدین اور منظور احمد خاں لُنڈ میں ہوا۔ مؤخر الذکر نے جو کام کیا اس کا اندازہ جماعت کے ایک کارکن کے ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے۔ "ہم جہاں بھی جاتے تھے۔ منظور احمد لُنڈ وہاں اپنی سائیکل پر پہنچ چکا ہوتا تھا۔ حالانکہ ہمارے

پاس جیپیں اور کاریں تھیں۔" ان حالات میں جماعت جیتی یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جماعت کو ووٹ نہیں ملے ڈاکٹر نذیر کو ملے ہیں۔ (صوبائی اسمبلی کے لئے بھی یہی ہوا۔ عطا محمد کھوسہ کامیاب ہوا۔ جس کا کردار کسی سے بھی چھپا نہیں ") جماعت نے جو دھاندلیاں کی ہیں۔ ان کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ نذیر کی بیگم نے پولنگ اسٹیشن پر خود ترازو پر مہریں لگا کر سینکڑوں ووٹ ڈالے۔ بعد میں سخت جھگڑا ہوا۔ اور فوج آگئی۔ خواجہ قطب الدین کے ۲۹ ہزار ووٹ تھے۔ وہ صرف ہزار ووٹوں پر ہار رہے تھے۔ تیسرے نمبر پر منظور احمد لنڈ تھے۔ جن کے اٹھائیس ہزار ووٹ تھے۔

جامپور، فاضلپور۔ راجن کی مشترکہ سیٹ سے۔ اصل مقابلہ شیر باز مزاری (آزاد) شوکت مزاری (پیپلز پارٹی) اور رمضان درویشک کے درمیان ہوا۔ مزاریوں کے بارے میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ کیسی پوزیشن رکھتے ہیں۔ شوکت مزاری، نوجوان ہیں، انہوں نے سامراج کے خلاف آواز بلند کی۔ ذوالفقار علی بھی وہاں گئے۔ انہوں نے شیر باز کے چیلنج کو مقبول کر لیا تھا۔ شیر باز خاں نے دھمکی دی تھی کہ بھٹو کی اوجھان بن جائے گی۔ لیکن لیکن ہوا اس کے برعکس۔ سامراجی پروپیگنڈا جو بھٹو کے روجھان میں آنے اور ڈیرہ غازیخاں میں نہ آنے کی وجہ سے ہوا۔ کافی کامیاب رہا۔ شیر باز خاں کو جماعت اسلامی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ تاہم بعد میں انہوں نے پیپلز پارٹی میں شرکت کی درخواست بھی دی۔ جو شاید نامنظور کر دی گئی ہے

پیپلز پارٹی کو قومی اسمبلی کی دو اور صوبائی کی چھ سیٹوں پر سے صرف ایک پر کامیابی ہوئی ہے وہ جہاں بھی ہاری ہے۔ دو یا تین ہزار ووٹوں پر ہارنے کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں اکثریت مزارعوں کی ہے۔ جو نوابوں۔ کھوسوں۔ بزداروں۔ مزاریوں اور مغاریوں کے ظلم برسوں سے سہتے آرہے ہیں۔ وہ خون پسینہ ایک کرتے ہیں۔ اور سال کے آخر میں زمیندار آکر تمام کی تمام کمائی لے جاتے ہیں۔ اور غریب مزارعہ جیتا رہ جاتا ہے۔ اگر وہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ تو اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی عزت و عصمت کو محفوظ نہیں پاتا اس لئے مجبوراً خاموش رہتا ہے۔

غزل

حزیں لدھیانوی

آج ہوا کا رُخ بدلا ہے، آج بنیں گی موجیں ساحل
سازِ جنوں پر نغمے گاتا، لے چل کشتی جانبِ منزل

کون کسی کے کام اب آئے، کون کسی کا درد بٹائے
ہر سینہ ہے زخمی زخمی، ہر دل ہے یاں گھائل گھائل

پت جھڑ کی رُت، پھول نہ کلیاں، پتّہ پتّہ لرزاں لرزاں
ایسے میں اُس پیکرِ گل کی یاد کا آنا مشکل مشکل!

کون غزالوں کو بہلائے، کون فضاؤں کو چمکائے
عشق سے خالی صحرا صحرا، حسن سے خالی محمل محمل

ہر دل میں احساس کی بجلی جاگ اٹھی ہے گھر سے نہ نکلو
بسمل بسمل لوگ کہیں گے دیکھ کے تم کو قاتل قاتل

فرقِ ستم پر تاج نہ ہو گا، تاریکی کا راج نہ ہو گا
اُبھری ہیں پھر ایسی کرنیں قریلے قریلے، محفل محفل



قارئین کہتے ہیں

علی محمد راشدی کو میرا کھلا چیلنج ہے

شمشاد علی وارثی

اِس قوم نے اس انتخاب میں جس سیاسی بیداری کا ثبوت دیا ہے اس سے پوری دنیا حیرت میں ہے اور ہر طرف سے پاکستان کے عوام کو ان کی سیاسی بیداری پر داد مل رہی ہے۔ پاکستان کے حریت پسند عوام نے اپنے حق ووٹ سے سیاسی میدان کے ایسے ایسے قلعے چکنا چور کر دیئے جو دولت کے بل بوتے پر یہ سمجھتے تھے کہ قیادت انہیں وراثت میں ملی ہے۔

پیر علی محمد راشدی صاحب نے ماہ جون سنہ ء میں سندھ کی سیاست پر چند مضامین لکھے جو کراچی کے مقبوضہ اخبار جنگ ۴ر جون، ۶ر جون، ۱۴ر جون، ۱۹ر جون کو شائع ہوا۔ اس کے بعد میں نے سندھ کے بزرگ معمر ترین سیاستدان پیر الٰہی بخش کا ایک انٹرویو لکھا جو اسی مقبوضہ اخبار ۱۰ر جولائی، ۲۷ر جولائی، ۳ر اگست کو شائع ہوا اور اس میں زیادہ تر میرے سابقہ تاریخی مضامین کی تصدیق تھی۔ ان مضامین میں زیادہ تر تعلق جناب پیر علی محمد راشدی اور کھوڑو صاحب سے تھا اور کیونکہ ایسے واقعات عوام کے سامنے آ رہے تھے جو حقائق تھے ان صاحبان کے لئے نقصان دہ "تلخ" بات ہمیشہ حق ہوتی ہے۔ راشدی صاحب جو سندھ کی پرانی سیاست میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے تھے اور ماضی میں جو کچھ ہوا اس میں ملوث تھے یہ ہی نہ کیا بلکہ صحافت کے اصول کو چھوڑ کر اپنے اس پرانے طریقہ کو میرے خلاف دہرانے لگے جو انہوں نے اور کھوڑو صاحب نے عوام کی مرضی کے خلاف ون یونٹ مسلط کرتے وقت جناب میر غلام علی تالپور مرحوم کے ساتھ کیا تھا۔ انتخابات سے قبل یہ بات مشہور کر دی گئی کہ جناب جی۔ ایم سید اور جناب شیخ مجیب الرحمٰن کا معاہدہ ہے اس لئے سندھ کی وزارتِ اعلیٰ صرف اور صرف راشدی صاحب بنائیں گے۔ ان کے مقابلے میں میں بہت غریب ہوں۔ کبھی اقتدار میری منزل نہیں رہا لیکن مجھے میرے ایک محترم بزرگ جناب حضرت مولانا ابو سعید بزمی مرحوم کے وہ الفاظ یاد ہیں جب میں سندھ آبزرور کے دفتر میں ان کے ہمراہ گیا۔ راشدی صاحب اس اخبار کے ایڈیٹر تھے تو مولانا نے کہا تھا کہ اس کی صحافت صرف حصولِ اقتدار کی خاطر ہے جو صحافت کے اصول کے خلاف ہے۔

راشدی صاحب انتخابات ختم ہو چکے ہیں اور آپ اپنی ہر کوشش کے باوجود شکستِ فاش کھا چکے ہیں حالانکہ آپ کی شکست سے کوٹڑی، سیہون، حال کوہستان کے ووٹر صاحبان کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر راشدی صاحب کی ضمانت ضبط نہ ہوئی تو ہم اس کو اپنی شکست تصور کریں گے۔ اب آپ فرصت میں ہیں۔ عوام نے آپ کو مکمل آرام کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے لہٰذا سندھ میں اپنی سابقہ عوامی خدمات پر کچھ مضامین لکھئے۔ جس طرح آپ پہلے اخبار جنگ کے صفحات کو صرف اپنی ذات کے لئے استعمال کر چکے ہیں اس کا مذکورہ مقبوضہ اخبار کو تو نقصان پہنچا مگر انتخاب میں آپ کی شکست برقرار رہی۔ میں آپ کے آئندہ کے مضامین کے جوابات کے لئے بھی حاضر ہوں۔ میرے علم میں یہ ہے کہ جب کھوڑو صاحب کے بنگلے پر نام نہاد سندھ کونسل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس ہو رہا تھا تو کھوڑو صاحب نے آپ کے حوالے سے یہ بات نواب زاہد علی خاں کو کہی کہ وارثی سندھ کی سیاست پر کافی مضامین لکھ رہا ہے جس سے کافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا جواب نواب زاہد علی خاں نے کیا دیا۔ لیکن میرا جواب حاضر ہے کہ میں نواب زاہد علی خاں کا کبھی ملازم نہیں رہا اور نہ آئندہ ارادہ ہے۔ وہ صرف میری برادری کی ایک سماجی تنظیم 'راجپوت فیڈریشن' کے چیئرمین ہیں

مقبوضہ اخبار کے ایڈیٹر سے گیارہ سوال

کراچی کے سب سے بڑے "اسلام پسند" اخبار کے سب سے بڑے "اسلام پسند" ایڈیٹر کو شکایت ہے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے نام نہاد "اسلام پسند" صحافیوں کو مکس اپ کرنے کے لئے کیوں کہا ہے۔ ان کی رائے میں ایسا کہنا آزادی صحافت کے منافی ہے کاش ان صاحب کا اپنا کوئی ضمیر ہوتا۔ اور وہ اس کی آواز سن سکتے۔ گزشتہ گیارہ مہینوں میں مودودیوں کے کارناموں پر ایک نظر ڈال لیتے تو انہیں یہ شکوہ کرنے کے بجائے۔ ندامت کا احساس ہوتا جناب ذوالفقار علی بھٹو نے گیارہ ماہ کی زیادتیوں کا صرف زبان سے اظہار کیا ہے۔ مگر پاپائے اچھرہ اور اس کے تنخواہ دار ایجنٹوں نے جو کچھ کیا وہ آزادی صحافت اور آزادی رائے کی نامعلوم کون سی مقدس اقدار تھیں جن پر ایڈیٹر مذکور نے ایک دن بھی قلم اٹھانے کی زحمت گوارہ نہیں فرمائی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سازش میں وہ بذات خود بھی شریک تھے ہم اس وقت چیں بہ جبیں ہونے والے ایڈیٹر سے یہ پوچھتے ہیں۔

۱۔ محترم ایڈیٹر صاحب آپ کو اس وقت کوئی شکایت کیوں پیدا نہ ہوئی جب پاکستان کے غریب مسلمانوں کی زبان گدی سے کھینچنے اور انڈونیشیا کی طرح مسلمانوں کا قتل عام کرانے کے احکامات صادر کئے گئے

۲- آپ کو آزادی صحافت کا سبق اس وقت کیوں یاد نہ آیا جب کہ آپ کے ہم پیشہ سینکڑوں صحافیوں کو بے روزگار کر کے ان کے معصوم بچوں کو بھوک اور افلاس کی غار میں دھکیل دیا گیا۔

۳- آپ کو اس وقت آزادی رائے کا خیال کیوں نہ آیا جب کہ آپ ہی کے اخبار کے ایک کالم نویس کو فکس اپ کرنے کے لئے درجنوں تار بھجوائے گئے۔

۴- آپ کو کوہستان کے بزرگ صحافیوں کی قلمی موت پر دو حروف لکھنے کی کبھی توفیق نہ ہوئی۔

۵- اس وقت آپ کی آزادی رائے اور آزادی فکر کو کیوں سانپ سونگھ گیا جب لاتعداد محترم اساتذہ کو مودودیت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

۶- آپ کو اس وقت کیوں شکایت پیدا نہیں ہوئی جب کہ ایک امریکی ایجنٹ "علما" کا بھیس بدل کر عربوں کے خلاف پاکستانی مسلمانوں میں غلط فہمیاں پھیلاتا پھر رہا تھا۔

۷- آپ نے ان ۱۱۳ نام نہاد علما کے خلاف کچھ بھی نہیں لکھا جن کا علم "چھان نامہ"، "چھپر نامہ" سے آگے نہ تھا۔ انہوں نے بیک جنبش قلم عالم اسلام کے ۸۰ فیصد مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا تھا۔

۸- آپ کو آزادی رائے کی فکر نے اس وقت کیوں نہ ستایا جب پی۔ آئی۔ اے۔ کے مودودی غنڈوں نے عوامی رہنماؤں اور ان کے استقبال کرنے والوں پر لاٹھیاں برسائیں۔ اور وہاں کی مخالف یونین کے عہدیداروں کو خون میں نہلا کر ننگا ڈانس کیا۔

۹- آپ نے اس وقت بھی کوئی اداریہ سپرد قلم نہیں فرمایا جب کراچی یونیورسٹی کے نام نہاد اسلام پسند وائس چانسلر نے طلبا کو علاج کا دھوکا دے کر جیل بھیج دیا۔

۱۰- آپ نے اس پر بھی احتجاج نہ کیا کہ مودودیوں کی غنڈہ فورس انصار المسلمین نے نئی کراچی، مزار قائداعظم اور عین عید کے دن ناظم آباد میں بے گناہ مسلمانوں کو اور ان کے بچوں کو زخمی کیا۔

۱۱- آپ نے مشہور "اسلام پسند" اے۔ کے سومار کی زبان بندی کے لئے کبھی نہ کہا۔ جس نے کھلم کھلا صحافیوں کا ناطقہ صاف کرنے کی دھمکی دی اور اس پر عمل بھی کیا۔

کے ای ایس سی کی انتظامیہ کیوں خاموش ہے

صفحہ ۳۰ سے آگے

حاضر ہیں اور آپ جیسے چاہیں ویسے ہی ہوگا۔ میں نے اُسے واضح لفظوں میں جواب دیا کہ "عدالت شاہ تمہاری طرح ہم بکاؤ مال نہیں ہیں تمہارے خلاف ہماری جدوجہد اصولی جدوجہد ہے ہمارا جو موقف پہلے تھا وہی اب ہے۔"

۱۵ دسمبر کو ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ان لوگوں نے کے ای ایس سی کے چار مراکز پر غنڈہ گردی کی مجھے گارڈن زون میں، اشفاق کو پاور ہاؤس میں، سرفراز کو بی ڈویژن میں اور رسول بخش بلوچ کو ناظم آباد ڈویژن میں زدوکوب کیا گیا۔ میں اور یہ مزدور دوست ساتھی انتظامیہ کی مجرمانہ خاموشی کا شکار ہوتے رہے۔ ہمیں ڈیوٹی ٹائم میں مارا گیا تھا۔ کے، ای، ایس، سی کی انتظامیہ بیٹھی یہ غنڈہ گردی دیکھتی رہی۔ اور اس کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ بلکہ انتظامیہ نے عدالت شاہ کو جو ایک عدد جیپ نمبر ۷۲۹۸ برسوں سے دے رکھی تھی اسے وہ اسی غنڈہ گردی کے لئے استعمال کرتا رہا۔

انتظامیہ خاموش لیکن عوامی فتح نے ان کارکنوں کے حوصلے بلند کر دیئے ہیں جو برسوں سے عدالت شاہ کی سرگرمیوں سے نالاں رہے ہیں۔ کے، ای، ایس، سی کے مزدور اب ان دلیلوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر عدالت شاہ کی دم چھلّہ یونین کے لاشے کو اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اس نے کے ای ایس سی کے مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافہ کرایا ہے۔ اور اتنا اضافہ اور کہیں نہیں ہوا۔ یونین کا یہ پروپیگنڈہ بھی سراسر جھوٹ ہے۔ شپ یارڈ، پورٹ ٹرسٹ اور بہت سی دوسری جگہوں پر تنخواہ میں اس سے بھی زیادہ اضافہ کرایا گیا ہے۔ پھر یہ کہ عدالت شاہ نے مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافہ نہیں کرایا ہے، بلکہ یہ بجلی جیسی اہم ضرورت کے ادارے کے مزدوروں کی قوت ہے کہ جس کی وجہ سے کے ای ایس سی کو مزدوروں کی تنخواہ میں اضافہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

انتظامیہ اکثر یہ ٹسوے بہاتی رہی ہے کہ یونین کو ان کی حمایت حاصل نہیں ہے اور وہ بھی (شیر علی خاں کی طرح) غیر جانبدار ہے۔ انتظامیہ کی اس غیر جانبداری کے ڈھول کا پول بھی حاضر ہے۔ یہ ایک ایسا دستاویزی ثبوت ہے جسے کے ای ایس سی کے ارباب حل و عقد جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ انتظامیہ نے اپنے ایک نوٹیفکیشن حوالہ نمبر ایل ۳۳/۷۰/۱۹۸۴، مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء کے ذریعے وہ فرائض انجام دیئے جو یونین کے ادارۂ رابطۂ عامہ کو کرنے چاہئیں تھے۔ اس نوٹیفکیشن میں بھٹو صاحب کو مبارکباد دینے والے چار ارکان کی یونین سے اخراج کی اطلاع کے ای ایس سی کے چیف انڈسٹریل اینڈ پبلک ریلیشنز آفیسر لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) ایل، ایس، کے لودھی نے ۵ ملازمین میں بھجوائی تھی۔ امید ہے اس دستاویز کی اشاعت کے بعد انتظامیہ اپنی غیر جانبداری کا ڈھونگ رچانے کی کوشش نہ کرے گی۔

بقیہ: فکس اپ کا مسئلہ

والے عوام کو فکس اپ کیا ہے۔ اب تم لوگ کس منہ سے مسٹر بھٹو کے خلاف احتجاج کرتے ہو جب کہ وہ اپنے اس ارادہ کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ تمہارے ان جرائم پر تمہارا احتساب کریں گے یعنی اپنی اصطلاح کے مطابق تم لوگوں کو فکس اپ کریں گے۔

عوام یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم میں سے کئی لوگ وقت بدلتے ہی بزدلوں کی طرح اپنا رنگ بدل چکے ہیں۔ تم میں سے کئی راتوں رات چولا بدل کر سوشلسٹ اور اسلامی سوشلزم اور چھ نکات کے مبلغ بن گئے ہیں تم میں کئی ایک نے بھٹو اور مجیب کے پاس "سفارتیں" بھیجنی بھی شروع کر دی ہیں۔ ممکن ہے تمہاری ان سفارتوں کے بعد بھٹو اور مجیب تمہارے ماضی کے جرائم بھول جائیں۔ "لبرل" ہو کر تمہاری خطاؤں کو معاف کر دیں۔ لیکن عوام، جو تمہارے ہاتھوں کئی بار زخمی ہو چکے ہیں تمہیں معاف نہیں کریں گے تم اپنے خون آلودہ ہاتھوں کو کیسے ہی دستانوں میں چھپا لو عوام تمہیں ڈھونڈ لیں گے۔ عوام تمہارا احتساب کرنے کے طریقے جانتے ہیں۔ اور ان کا فیصلہ کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi

14 - 21, JANUARY. 1971